دشتِ خیال

افسانے

انشائیے

دشتِ خیال

(افسانے، انشائیے)

کرشن چندر

ممتاز اکیڈیمی

کراچی ——————— لاہور

ناشر : اقبال عرشی
قیمت : تین روپے پچاس پیسے
بار : اول سنہ ۱۹۶۵ء
سرورق : حفیظ سرور

اِنتسَاب

اُردو زبان کے مستقبل کے نام ــــــ !!

کرشن چندر !!!

ترتیب

حیدر علی ملک

گردشِ ایام

(کرشن چندر سے ایک انٹرویو)

حیدر :- کرشن جی آداب!

کرشن چندر :- آداب ملک صاحب!

ح :- اب میں سوالوں کا سلسلہ شروع کرتا ہوں - یہ سلسلہ شاید آپ کو افسانہ کی طرح دراز نظر آئے - بہرحال سب سے پہلے یہ بتائیے کہ آپ کا اصل نام کیا ہے؟ اس سے میری مراد وہ نام ہے جو آپ کے والدین نے رکھا تھا۔

ک :- میرا اصلی نام کرشن چندر ہی ہے۔ یہی نام والدین نے رکھا تھا۔
اسی نام سے دنیا جانتی ہے۔

ح :- آپ کی عمر اس وقت کیا ہے؟ یعنی کس تاریخ، کس مہینے اور کس سن
میں آپ پیدا ہوئے تھے؟

ک :- عمر کے بارے میں تھوڑا سا گھپلا ہے۔ اب تک میں اپنی تاریخ پیدائش
۲۶ر نومبر اور سن ولادت سن ۱۹۱۴ء سمجھتا رہا۔ اب کی والدہ
صاحبہ سے استفسار کرتے یہ معلوم ہوا کہ سن ولادت ۱۹۱۳ء
ہے اور تاریخ وہی ۲۶ر نومبر

ح :- کہیں یہ عمر وہ عمر تو نہیں جو آپ کے سرٹیفکیٹ میں درج ہے؟

ک :- مجھے معلوم نہیں کس سرٹیفکیٹ کی بات کر رہے ہیں آپ۔ کتنے
ہی بل چکے ہیں۔ اگر اشارہ میونسپل سرٹیفکیٹ کی طرف ہے تو وہ میرے
پاس ہے نہیں کسی ڈگری کا کاغذ بھی نہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ عمر جو بھی ہو
اب ختم ہونے کو ہے

ح :- آپ کے پتا جی کا شبھ نام اور اُن کا مشغلہ کیا تھا؟

ک :- گوری شنکر۔ ڈاکٹر تھے۔

ح :- آپ لوگ کل کتنے بھائی اور بہن ہیں؟ اُن سب کے نام بتائیں۔

ک :- تین بھائی ہیں۔ کرشن چندر، مہندر ناتھ، اوپندر ناتھ۔ ایک

بہن ہیں سرلا دیوی

ح :- آپ کا وطن ؟

ک :- کوئی نہیں (صحیح معنوں میں) مجازی وطن ہندوستان

ح :- اور جائے پیدائش ؟

ک :- لاہور

ح :- آپ نے کہاں تک۔ اور کن کن اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائی۔

ک :- وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول پونچھ میں میٹرک تک، فارمن کرسچین کالج لاہور میں ایم۔اے تک لا کالج لاہور سے ایل ایل بی کیا۔

ح :- آپ کے ادبی سفر کا آغاز کب ہوا؟

ک :- سنہ ۱۹۳۶ء میں۔

ح :- آپ کی سب سے پہلی کہانی کا عنوان اور موضوع کیا تھا ؟ اور یہ کس رسالہ میں شائع ہوئی تھی ؟

ک :- "جہلم میں ناؤ پر" رسالہ "ہمایوں" لاہور میں شائع ہوئی تھی۔

ح :- آپ کی اب تک کل کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں ؟

ک :- پچاس کے قریب

ح :- اس میں ناول کتنے ہیں ؟

ک :- پندرہ کے قریب۔

ح :- افسانوں کے مجموعے!

ک :- بیس کے قریب۔

ح :- اِنشائیوں کے؟

ک :- چار

ح :- ڈراموں کے مجموعے کتنے ہیں؟

ک :- تین

ح :- اور بچوں کے لئے کہانیوں کی کتابیں کتنی ہیں؟

ک :- بچّوں کے لئے ناول لکھے ہیں۔ اُلٹا درخت، لال تاج، چالاک خرگوش، چڑیوں کی الف لیلہ، ستاروں کی سیر، بہادر گارجنگ، جمیک کا قلعہ، سات ناول ہوئے کُل۔

ح :- کیا آپ نے کبھی ترجمے کا کام بھی کیا ہے؟

ک :- نہیں۔

ح :- آپ کی تخلیقات کے ترجمے کن کن زبانوں میں ہو چکے ہیں؟

ک :- ہندوستان کی پندرہ بڑی زبانوں میں۔ روس کی بیس زبانوں میں یوروپی زبانوں میں انگریزی، ڈچ، چیک، اطالوی، جرمن، پولش ہنگرین، رومانین، بلگرین، سلوواک اور سویڈش میں ہوتے ہیں ایشیائی زبانوں میں سنہالی، عربی، چینی، جاپانی اور کوریائی زبان میں

ح :- آپ کن کن زبانوں سے واقفیت رکھتے ہیں ؟

ک :- اردو ، ہندی ، انگریزی ، پنجابی ،

ح :- آپ کی نظر میں آپ کا سب سے اچھا ناول کونسا ہے ؟

ک :- وہ ابھی تک لکھا نہیں گیا۔ ویسے شکست ، جب کھیت جاگے اور غدار مجھے زیادہ پسند ہیں۔

ح :- آپ کن کن افسانوں کو اپنے بہترین افسانے سمجھتے ہیں ؟

ک :- بالکونی ، زندگی کے موڑ پر ، کالو بھنگی ، ان داتا ، مہالکشمی کا پل ، دانی ، تائی ایسری زیادہ پسند ہیں۔

ح :- آپ کے کامیاب انشائیے کون کون سے ہیں ؟

ک :- یوگا ، ہوائی قلعے ، لوکی ، ملا گنجا ، گانا۔

ح :- آپ کے کچھ اچھے ڈرامے کون کون ہیں ؟

ک :- دروازے کھول دو ، سرائے کے باہر ، نیل کنٹھ ،

ح :- بچوں کے لئے آپ اپنی کس کہانی کو بہترین کہانی تصوّر کرتے ہیں ؟

ک :- لکڑی کا جھنجھنا

ح :- ملکی اور غیر ملکی افسانہ نگاروں میں آپ کن کن کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں ؟

ک :- ہم عصروں میں منٹو ، ندیم ، بیدی ، عصمت ، عباس پسند ہیں نئی نسل

کے افسانہ نگاروں میں رام لال، جیلانی بانو، گدی، اشفاق احمد شوکت، مگر اور بھی بہت سے ہوں گے۔ دراصل یہ نام گِنانے کا سلسلہ غلط ہے۔ غیر ملکی ادیبوں میں چیخوف، گورکی، دوستووسکی بہت پسند ہیں۔ مگر بے حد پسندیدہ مغربی ادیبوں کی فہرست بھی بے حد طویل ہے۔ کیا کیجیئے گا جان کر........؟

ح :۔ نئی نسل کے اردو افسانہ نگاروں میں آپ کن کن کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں؟

ک :۔ اُوپر بتا چکا ہوں واجدہ تبسّم کے شروع کے افسانے بہت عمدہ تھے۔ جانے اب کیا ہُوا؟

ح :۔ آپ کے فن نے کسی ملکی یا غیر ملکی افسانہ نگار سے اثر قبول کیا ہے یا نہیں؟ اگر ہاں تو کس سے؟

ک :۔ اس کا تجزیہ کوئی دوسرا ہی کر سکتا ہے۔

ح : کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو افسانہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے؟

ک :۔ ہیئت کے اعتبار سے میرا جواب ہاں میں ہے مواد کے اعتبار سے نفی میں۔

ح :۔ آپ کے خیال میں ایک اچھے افسانے کی تعریف کیا ہے؟

ک :۔ کسی بھی زندہ اور بدلتی ہوئی صنفِ ادب کو تعریف کی حدود

میں نہیں باندھا جا سکتا۔

ح:۔ ہندی میں آپ کی کہانیاں کس طرح شائع ہوتی ہیں؟ کیا آپ ہندی میں بھی کہانیاں لکھتے ہیں یا آپ کے نقل نویس اردو کہانیوں کو دیوناگری رسم الخط میں لکھ کر ہندی رسالوں کو بھیج دیتے ہیں؟

ک:۔ زیادہ تر اردو میں لکھتا ہوں۔ کبھی کبھی ہندی میں میرے ہاں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے نقل نویس کام کرتے ہیں۔

ح۔ آپ نے کون کون سی ملازمت اختیار کی، اور آپ کی وابستگی کن کن اداروں سے رہی ہے؟

ک:۔ کالج سے نکلتے ہی تین سال کے لئے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت اختیار کی تھی۔اس کے بعد کبھی ملازمت نہیں کی۔

ح:۔ آپ کی نظر میں موجودہ دور میں مذہب کی کیا اہمیت ہے؟

ک:۔ مذہب اگر کسی منظم فلسفۂ حیات کا نام ہے تو ہر دور میں اس کی اہمیت تسلیم کی جائے گی۔ جب مذہب اوہام کے سلسلے، نفرت کے جذبے اور جہالت کے پردے کا کام دینے لگے، تو میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔

ح:۔ آپ کا مسلک؟

ک:۔ انسانیت!

ح :- اشتراکیت کے متعلق آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟

ک :- انسانیت کے راستے میں ایک بہت بڑا قدم آگے لے جانے والا۔

ح :- کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک اب تک زندہ ہے؟

ک :- ترقی پسند اور رجعت پسند دونوں تحریکیں زندگی کے ہر شعبے میں ہمیشہ سے ساتھ ساتھ چلتی رہی ہیں۔ آگے بھی چلیں گی۔ ان کی آویزش اور آمیزش ہی سے زندگی عبارت ہے۔ صرف مفہوم بدلتا رہتا ہے

ح :- اب تک آپ نے کتنی فلموں کی کہانیاں مکالمے یا اسکرین پلے لکھے ہیں؟ اپنی کچھ اچھی فلموں کے نام بتائیے۔

ک :- کوئی بیس کے قریب فلمیں لکھی ہیں۔ اچھی فلم لکھنے کا موقع ابھی تک نہیں ملا۔ کامیاب فلمیں سات آٹھ ہیں۔ جن میں سے سلور جوبلی تصویریں ہیں۔ چار۔ مگر عمدہ اور شستہ ذوق کی تصویر کہاں سے لاؤں؟

ح :- آپ فلموں سے کب سے وابستہ ہیں؟

ک :- سنہ ۱۹۴۴ء سے

ح :- فنونِ لطیفہ میں آپ کو کن کن فنون سے دلچسپی ہے؟

ک :- مصوری اور موسیقی۔

ح :- آپ کی نظر میں اردو زبان و ادب کا مستقبل؟

ک :۔ مغربی پاکستان میں روشن، ہندوستان میں مدھم مدھم۔ مشرقی پاکستان میں صفر!

ح :۔ آپ اپنی زود نویسی کے لئے مشہور ہیں اس لئے یہ بتائیے کہ آپ نے ایک دن میں زیادہ سے زیادہ کتنی کہانیاں لکھی ہیں؟

ک :۔ میری زود نویسی کی شہرت معتبر نہیں ہے۔ یہ ہوائی دشمنوں کی اڑائی ہوئی ہے۔ میں نے اب تک کل تین سو کے قریب افسانے لکھے ہیں اور یہ افسانے گزشتہ اٹھائیس سال میں لکھے گئے ہیں یعنی اوسطاً ایک سال میں بارہ افسانے یعنی ایک ماہ میں ایک ...... دراصل یہ کام چوروں کا ملک ہے۔ جہاں اُس افسانہ نویس کو بھی زود نویس سمجھ لیا جاتا ہے جو ایک ماہ میں ایک افسانہ بھی لکھ دے۔

ج - آپ نے کن کن ملکوں کا سفر کیا ہے؟

ک۔ ہانگ کانگ، چین، روس، انگلینڈ، فرانس، سوئٹزرلینڈ، لبنان، چیکوسلواکیہ۔

ج - ہندوستان کے کون کون سے شہر اور مقامات آپ کو بہت زیادہ پسند ہیں؟

ک :۔ کشمیر، نینی تال، بمبئی۔

ح :۔ اردو افسانے کے موجد پریم چند اور اردو کے پہلے ناول نگار نذیر احمد

کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے

ک ۔ پریم چند اور نذیر احمد دونوں کو آج بھی دلچسپی سے پڑھا جا سکتا ہے اردو ادب دونوں ہی کا۔۔۔۔۔۔ احسان مند ہے اور یہ دونوں ادیب ہماری روایت کی عظمت کے ممتاز رکن ہیں۔

ح ۔ کیا آپ اردو نقادوں کی روش اور رویئے سے مطمئن ہیں ؟

ک ۔ مختلف نقادوں کا مختلف رویّہ ہوتا ہے۔ الگ الگ روش ہے۔ کس کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں ؟

ح جدید نقادوں میں کون کون سے نقاد قابل قدر ہیں ؟ کچھ نقادوں کے نام لیجیئے ۔

ک ۔ احتشام حسین، مجتبیٰ حسین، ممتاز حسین، محمد حسن عسکری، خورشید الاسلام، کلیم الدین احمد، ان لوگوں نے خاص طور پر قابلِ قدر کام کیا ہے۔ گو میں ان سب سے اختلاف بھی رکھتا ہوں اور شدید۔

ح ۔ آپ کی کہانیوں کی بنیاد تخیّل پر ہوتی ہے یا کسی حقیقی واقعہ پر؟

ک ۔ مواد زندگی سے لیتا ہوں ۔ افسانہ تخیل کے تانے بانے سے بُنتا ہوں

ح ۔ حسن وعشق کے متعلق آپ کا نظریہ ؟

ک ۔ حسن کائنات کی گرامر ہے ۔ اِسے سمجھنے کے لئے عشق کرنا ضروری ہے

ح ۔ کیا آپ کہانیاں ڈکٹیٹ (Dictated) بھی کراتے ہیں ۔

ک ۔ نہیں !

ح ۔ اچھا یہ تو بتلائیے کہ اردو کے موجودہ رسم الخط کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟ کیا آپ بھی اسے تبدیل کر دینے کے حق میں ہیں ! اگر ہاں ! تو سب سے مناسب رسم الخط آپ کس رسم الخط کو سمجھتے ہیں جس میں اردو لکھی جانی چاہیئے ؟

ک :۔ میرا خیال ہے کہ اگلے پچاس برس میں بیشتر زبانوں کا رسم الخط رومن ہو جائے گا ! جب تک یہی رسم الخط رہے تو کیا مضائقہ ہے ؟ اگر بدلنا ہی ہے تو رومن میں بدل کر دوسری زبانوں کی رہنمائی کیجئے ۔ مگر یہ کام بھی میرے مرنے کے بعد کیجئے گا ۔

ح ۔ بہت بہت شکریہ کرشن جی ۔۔ آپ نے اپنا قیمتی وقت میرے لئے صرف کیا ۔ میں اس کے لئے آپ کا بے حد ممنون ہوں

ک ۔ اور میں آپ کا ! ۔۔۔ آداب عرض

○

گڈھا

ایک آدمی گڈھے میں گر گیا اور شور مچانے لگا "مجھے بچاؤ، بچاؤ۔ میں گڈھے میں گر گیا ہوں۔ مجھے باہر نکالو۔"

گڈھا سڑک کے عین بیچ میں تھا۔ اور ہر ایک کو دکھائی دیتا تھا۔ اور بہت پرانا تھا۔ گڈھا اتنا چوڑا نہ تھا۔ جتنا گہرا تھا۔ اُس پر سے موٹریں بہت آسانی سے گزر جاتی تھیں۔ اور جب تک موٹریں بہ آسانی کسی گڈھے پر سے گزرتی رہتی ہیں۔ اس کی مرمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شور سن کر دو آدمی آئے۔ ایک آدمی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ دوسرا خاکی نیکر۔ پتلون والا آدمی گڈھے کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کاپی اور پنسل تھی خاکی نیکر والا آدمی گڈھے کے کنارے اکڑوں بیٹھ گیا اور اطمینان سے بیڑی پینے لگا۔ اور بیڑی کی خاک گڈھے میں جھاڑتا رہا۔

"مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ۔ میں گڈھے میں گر گیا ہوں"۔ گرے ہوئے آدمی نے گڈھے میں سے ہاتھ نکال کر زور سے چلانا شروع کیا۔

خاکی نیکر والے آدمی نے اپنی جیب سے چمڑے کا ایک گول ڈبہ سا نکالا۔ اُس ڈبّے کے اُوپر پیتل کا ایک بٹن لگا ہوا تھا۔ خاکی نیکر والے نے بیڑی ختم کر کے پیتل کے بٹن کو گھمایا۔ چمڑے کے ڈبّے میں سے چمکتے ہوئے فولاد کا ایک فیتہ نکلا جو گراری کی طرح باہر نکلتا گیا۔

پتلون والے نے دانتوں میں پنسل دبا کر کہا۔ "بولو"! خاکی نیکر والے نے اسٹیل کے فیتے کو گڈھے کے اُوپر رکھ کر جواب دیا "لمبائی پندرہ فٹ"
پھر اُس نے فیتے کا رُخ بدل کر پیمائش کی بولا "چوڑائی آٹھ فٹ"۔ پھر اُس نے گڈھے کی گہرائی کو جانچا۔ بولا "گہرائی بائیس فٹ"۔

"چچ چچ ......" پتلون والا صاحب بولا "بہت گہرا ہے"۔

"یہی تو میں بھی کہتا ہوں!" گرا ہوا آدمی چلّایا۔

گڈھا بہت گہرا ہے میں خود نہیں نکل سکتا۔ مجھے دوسروں کی مدد درکار ہے۔ مہربانی کر کے بھائیو۔ مجھے اس گڈھے سے نکالو۔ نہیں تو میں اس میں پڑا پڑا بھوکا پیاسا مر جاؤں گا۔"

"چپ رہو" پتلون والا آدمی نہایت سختی سے بولا۔ "ہمارا کام گڈھے کی پیمائش کرنا ہے۔ گرے ہوؤں کو نکالنا نہیں ہے۔"

اتنا کہہ کر پتلون والے نے خاکی نیکر والے کو اشارہ کیا۔ "چلو، ہمیں ابھی اس سڑک کے بہت سے گڈھے دیکھنے ہیں"

خاکی نیکر والا اپنی جلی ہوئی بیڑی گڈھے میں پھینک کر پتلون والے کے ساتھ چلا گیا۔

گرا ہوا آدمی پھر چلانے لگا "میں گڈھے میں گر گیا ہوں۔ مجھے باہر نکالو۔ باہر نکالو کسی طرح......"

اُس کا شور سن کر تین آدمی آئے۔ اور گڈھے کے تینوں طرف کھڑے ہو گئے۔ دو آدمی سفید اچکن اور دھوتی پہنے ہوئے تھے۔ تیسرے نے ٹیری لین کی عمدہ پتلون پہن رکھی تھی۔ اُس کے جوتے بہت چمکدار تھے۔

وہ لوگ بہت غور سے گڈھے میں گرے ہوئے آدمی کو دیکھنے لگے۔

گڈھے میں گر گیا ہے ؟" ایک بولا

"ہاں،" دوسرے نے تائید کی۔

"گڈھا ہی معلوم ہوتا ہے۔!"

"ہر سڑک پر گڈھے ہوتے ہیں" تیسرا بولا "اگر چلنے والا احتیاط کرے تو ہرگز گڈھے میں نہیں گر سکتا،"

"بے شک کبھی نہیں گر سکتا۔" پہلا بولا "ہماری میونسپلٹی ہر سڑک پر اتنے بڑے بڑے گڈھے بناتی ہے کہ آنکھ کھول کر چلنے والا اس میں کبھی گر ہی نہیں سکتا۔" یہ سب اس کا اپنا قصور ہے!"

"میرا کوئی قصور نہیں ہے"۔ گرا ہوا آدمی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں کل رات سے اس گڈھے میں گرا ہوا ہوں۔ سڑک پر اندھیرا تھا اس سڑک پر بجلی کے کھمبے بہت دور دور ہیں۔ اور اس گڈھے کے بالکل سامنے بجلی کا جو کھمبا ہے اس کا لیمپ ٹوٹا ہوا ہے۔ یقین نہ آئے تو خود دیکھ لو۔ رات بہت اندھیرا تھا۔ میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا گھر جا رہا تھا کہ اس گڈھے میں گر گیا۔ مجھے اس گڈھے سے نکالو۔ میرے حال پر رحم کرو۔ میری بیوی گھر پر میرا انتظار کر رہی ہے۔"

"جلدی چلو!" دوسرے آدمی نے سڑک کے ایک طرف اشارہ کر کے باقی دو ساتھیوں سے کہا۔ "وہ اسٹاک ایکسچینج کو جانے والی

بس آ گئی۔ اِس کمبخت کو نکالنے میں لگ جاؤ گے تو ہزاروں کا نقصان ہو جائے گا۔"

وہ لوگ تیزی سے اسٹاک ایکسچینج کو جانے والی بس کی طرف دوڑے۔

اب کے گڈھے میں گرا ہوا آدمی اتنے زور سے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلایا کہ گڈھے کے گرد بہت سے آدمی جمع ہو گئے۔ سب لوگ حیرت سے اُس گرے ہوئے آدمی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس گرے ہوئے آدمی کو گڈھے سے نکالے۔

"گڈھا بہت گہرا ہے" ایک آدمی نے اظہارِ افسوس کیا۔

"اور اس میں کیچڑ بھی ہے۔" دوسرا بولا

"اسے بچانے والا خود بھی گڈھے میں گر سکتا ہے۔" تیسرا بولا۔

"کپڑے بھی خراب ہوں گے۔" چوتھا بولا۔

"مگر کسی نہ کسی کو تو اس بے چارے کو نکالنا ہی چاہیئے۔" ایک ادھیڑ عورت اپنے بچے کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

بہت سے لوگوں کو سڑک کے بیچ میں اکٹھا ہوتے دیکھ کر ایک سنتری تیزی سے بھاگا بھاگا آیا۔ اُس نے غصّے میں آ کر مجمع تتر بتر کرنا شروع کیا۔

کیا ہوا ؟ — بھاگو — بھاگو — راستہ دو۔ راستے سے ہٹ جاؤ، یہ خلافِ قانون مجمع ہے۔ باؤلے ہوئے ہو۔ احمق ہو تم سب! کیا تم نے آج تک کسی کو گڈھے میں گرا ہوا نہیں دیکھا؟ کوئی عجوبہ ہے یہ جو اتنی بھیڑ لگا رکھی ہے!!

ہٹو۔ بھاگو یہاں سے ورنہ ابھی لاٹھی چارج کرتا ہوں۔"

پولیس کی وردی دیکھ کر لوگ اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ پولیس مین گڈھے کے کنارے کھڑا رہا۔ اُس نے اپنی نوٹ بک نکالی۔ اور غرّا کر بولا:-

"بدمعاش جان بوجھ کر گڈھے میں گرا ہے اور یہ مجمع لگا کر لوگوں سے پیسے بٹورنے کا نیا ڈھنگ نکالا ہے۔"

"دہائی ہے سنتری صاحب! میں بدمعاش نہیں ہوں۔ میں گڈھے میں گر گیا ہوں۔ مجھے باہر نکالو!"

سنتری نے غور سے گڈھے کے اندر دیکھا۔ نیچے گڈھے کے اندر پانی کا پائپ نظر آ رہا تھا۔ اور اس میں سے پانی رس رس کے باہر نکل رہا تھا۔ اور گڈھے میں جمع ہو رہا تھا۔

"تم پائپ کو نقصان پہنچانے کے ارادے سے گڈھے میں داخل ہوئے ہو۔" سنتری غصے سے چلایا۔ "تاکہ شہر میں ہیضہ پھیل جائے۔

تم مجھے کوئی خطرناک غیر ملکی ایجنٹ معلوم ہوتے ہو۔"

"میں کوئی غیر ملکی ایجنٹ نہیں ہوں - دہائی ہے سنتری صاحب میں ایک غریب شہری ہوں - نئی تعمیر ہونے والی بلڈنگوں پر اینٹیں ڈھو ڈھو کر اپنا پیٹ پالتا ہوں"

"سب معلوم ہو جائے گا - پولیس کو سب معلوم رہتا ہے - اپنا نام بتاؤ۔" سنتری نے گرج کر پوچھا -

گرے ہوئے آدمی نے اپنے رہنے کی جگہ بتائی -

"اپنی عمر بتاؤ۔"

گرے ہوئے آدمی نے اپنی عمر بتائی - پولیس مین نے گرے ہوئے آدمی کو دیکھ کر اس کا ناک نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کر کے ڈائری میں لکھ لیا - بولا -

"تمہارا چالان ہو گا -

"بے شک چالان ہو جائے - مگر مجھے اس گڑھے سے تو نکالو -"
گڑھے میں گرے ہوئے آدمی نے دانت پیس کر کہا -

"میں تمہیں اس گڑھے سے نہیں نکال سکتا۔" پولیس مین نے اپنی نوٹ بک اور پنسل جیب میں رکھنے سے پہلے اُس میں سے ایک پرچہ پھاڑا اور اُسے گڑھے میں گرے ہوئے آدمی کی طرف

پھینک کر بولا "یہ تمہارا چالان ہے۔ کل صبح دس بجے سے پہلے چوک کے تھانے میں حاضر ہو۔"

سنتری چلا گیا۔ گرا ہوا آدمی دیر تک حیرت اور ڈر سے چپ رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلانے لگا۔ دیر تک چلاتا رہا۔ چلاتے چلاتے اُس کی آواز بیٹھ گئی۔ اور اُس کے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ اُسے بہت زور کی پیاس محسوس ہونے لگی۔ بالآخر اُس نے رستے ہوئے پائپ کے جائنٹ کو ذرا سا کھولا۔ اُس میں سے پانی کی دھار زور سے نکلی۔ گرے ہوئے آدمی نے اپنا منہ پائپ کے جائنٹ سے لگا دیا۔ اور شکم سیر ہو کر پانی پیا۔ پھر اس نے زور لگا کر پائپ کا جائنٹ بند کر دیا۔ اب پائپ سے پانی بالکل نہ گرتا تھا۔

پانی پی کر وہ چند لمحوں کے لئے تو چپ رہا۔ پھر جب اُس نے نگاہ اوپر اُٹھائی تو بہت سی آنکھوں کو اپنے اوپر تکتے ہوئے پایا۔

"ایک آدمی ہے جو گڑھے میں گر کر پائپ کھول کر اپنی پیاس بجھا رہا ہے۔" ایک آدمی بولا۔

"حالانکہ اپنے گھر بھی بجھا سکتا تھا۔" دوسرا بولا "بہت عجیب

آدمی ہے۔"

"مجھے تو کوئی فقیر معلوم ہوتا ہے۔" تیسرا بولا

"بابا کیلا کھاؤ گے؟" چوتھے آدمی نے جو بہت سے کیلے لئے ہوئے تھا، ایک کیلا پھینکتے ہوئے کہا۔

گڈھے میں گرے ہوئے آدمی نے جلدی سے کیلا دبوچ لیا۔ کیونکہ اسے بہت بھوک لگی ہوئی تھی۔ چھلکا اتار کر اُس نے ایک ہی بار سارا کیلا نگل لیا۔ گرے ہوئے آدمی کی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں اور اُس کا حلق کیلے کو نگلتے ہوئے عجیب طرح سے چل رہا تھا۔ کیلا پھینکنے والے نے اُس کے حلق کی اس حرکت کو دوبارہ دیکھنے کے لئے دوسرا کیلا اُس کی طرف پھینکا۔ گڈھے میں گرا ہوا آدمی دوسرے کیلے کو بھی فوراً نگل گیا۔

"اب نمبر بتاؤ!"

"گھر کا نمبر؟" گرے ہوئے آدمی نے پوچھا

"گھر کا نمبر نہیں۔ سٹّے کا نمبر...... بابا.....!"

"میں کوئی بابا نہیں ہوں۔" گڈھے میں گرا ہوا آدمی زور سے چلایا۔

"میں ایک غریب شہری ہوں۔ اینٹ ڈھونے والا۔ کل رات

کے گیارہ بجے سے اس گڈھے میں گرا ہوا ہوں اور کوئی آدمی میری مدد کو نہیں آتا - ارے کیسے ہو تم ظالم لوگ ؟"

"سالا دد کیلے کھا گیا ہمارے - اور ہمیں کو ظالم بتا رہا ہے" کیلے والا بولا -

"اور اوپر سے نمبر بھی نہیں بتاتا ،" دوسرے آدمی نے گڈھے کے کنارے سے مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھا لیا" ماروں سالے کے سر پر اور پھوڑ دوں اس کا سر ؟"

تیسرا بولا -" احمق ہوا ہے - سمجھتا نہیں - بابا جی نے نمبر بتا دیا ہے ،"

"کیا ؟"

"گیارہ — !"

"گیارہ ؟

"ہاں گیارہ ! — یعنی ایک سے ایک !"

باپ رے ! — ارے بھاگ - نمبر لگانے کا ٹائم نکلا جا رہا ہے ،"

"ارے کوئی مجھے اس گڈھے سے نکالو !" گرا ہوا آدمی چلایا لیکن نمبر لگانے والے بھاگ گئے تھے اُسے گڈھے میں چھوڑ کر ...

تھوڑی دیر کے بعد ایک شاندار موٹر اُس گڑھے کے قریب آ کر رُکی اور اُس میں سے ایک لمبا تڑنگا، گورا چٹا آدمی نِکلا، جس نے بہت قیمتی مغربی طرز کا سوٹ پہن رکھا تھا، اُس کی پر بہت قیمتی چشمہ تھا۔ جب وہ گڑھے میں گرے ہوئے آدمی کو دیکھ کر مسکرایا تو گرے ہوئے آدمی کو اُس کے دانتوں میں دو دانت سونے کے دکھائی دیئے۔ شکل و صورت سے وہ کوئی غیر ملکی معلوم ہوتا تھا۔

"ہیلو!" غیر ملکی بولا۔ "میرا نام یارتر پگ ہے۔"

"صاحب!" گرا ہوا آدمی نہایت لجاجت سے بولا۔ "مجھے اس گڑھے سے باہر نکالو۔"

صاحب اپنی کلائی پر بندھی ہوئی بیش قیمت گھڑی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "صرف آدھ گھنٹہ لوں گا۔"

"آدھ گھنٹہ کیا، ایک گھنٹہ لے لیجیے۔ دو گھنٹے لے لیجیے۔ مگر کسی طرح مجھے اس گڑھے سے باہر نکالئے۔"

"میں تم سے کچھ سوالات کا جواب چاہتا ہوں۔" گورے آدمی نے کالی جلد والی ایک موٹی سی نوٹ بک اور ایک بیش قیمت فونٹن پن نکالا۔

"پوچھئے!" گرے ہوئے آدمی نے بے صبری سے کہا۔

"تم کب سے اس گڑھے میں ہو؟"

"کل رات سے!"

"کل رات سے تو ہو۔ لیکن کیسا لگتا ہے؟ تم کیا محسوس کرتے ہو کہ یہاں کب سے ہو۔"

"ایسا لگتا ہے جیسے سینکڑوں سال گزر گئے۔"

"آہ!" گورے آدمی نے جلدی جلدی لکھتے ہوئے کہا۔ "میں یہی جواب چاہتا تھا۔..... اچھا، اب یہ تو بتاؤ کہ جب تم گڑھے میں گرے اُس وقت تم نے کیا محسوس کیا۔؟"

"کیا محسوس کیا؟ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ اُس وقت تمہارے لاشعور کے اضطراب بے شعور کی حرکت منفی کیا تھی؟"

"مجھے معلوم نہیں۔"

"کیا تم اس گڑھے میں خوش نہیں ہو؟"

"ہرگز نہیں!"

"نہیں"

"بہت ناشکرے ہو۔ یہ نہیں سوچتے کہ اگر تمہیں اس سے بھی گہرا گڑھا مل جاتا تو تمہاری ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی۔"

"اے صاحب، میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں" گرا ہوا آدمی ہاتھ جوڑ کر منت کرنے لگا۔" ایسے اوندھے سیدھے سوال مجھ سے مت کرو۔ میں ایک غریب بے یار و مددگار انسان ہوں۔ مجھے کسی طرح اس گڑھے سے نکالو۔"

"جرمن پرابلم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"جرمن بلم؟ ــــ اے صاحب، میں نے آج تک کوئی بلم استعمال نہیں کیا۔ قسم لے لو۔ میں تو ساری عمر اینٹیں ڈھوتا رہا ہوں۔"

"امریکہ یا روس؟ ــــ ان دونوں میں سے تم کسے بہتر سمجھتے ہو؟"

"جو مجھے گڑھے سے نکالے ......!" گرے ہوئے آدمی نے آنکھیں بند کر کے بالکل نرچ ہو کر کہا۔

گورے آدمی نے اپنی نوٹ بک بند کی اور مسکرا کر کہا "تھینک یو، تم نے اس مصیبت کے باوجود میرے سوالات کا جواب دیا۔ میں اس کے لئے تہِ دل سے تمہارا شکر گزار ہوں۔ اب میں جاتا ہوں"

"مگر مجھے گڑھے سے تو نکالتے جاؤ" گڑھے میں گرا ہوا آدمی منت سماجت کرنے لگا۔

"ساری!" گورا بولا "یہ میرا کام نہیں ہے۔ میں دراصل ٹیکنیکل ایڈ کا نمائندہ ہوں"

کا بھیجا ہوا فارن ایکسپرٹ ہوں۔ میں اپنے ترقی یافتہ ملک سے تمہارے پچھڑے ہوئے ملک کی مدد کرنے کے لئے بھیجا گیا ہوں"

"تو میری بھی مدد کرو گورے صاحب!"

"ہماری یہ میرا کام نہیں ہے۔ میرا کام سڑک کے گڈھوں کے اعداد و شمار جمع کرنا ہے۔ اور گڈھے میں گرے ہوئے لوگوں کا نفسیاتی مطالعہ پیش کرنا ہے۔ میں اس کام کے لیئے دو سال تک تمہارے ملک کا دورہ کروں گا، ہر سڑک کے ایک ایک گڈھے کو دیکھوں گا۔ پھر اپنے ملک میں جا اس کی رپورٹ پیش کروں گا۔ اس کام میں ایک سال لگ جائے گا۔ پھر اس رپورٹ پر غور و خوض ہوگا۔ ممکن ہے دو سال اس میں لگ جائیں۔ اس کے بعد یہ رپورٹ مناسب مشوروں کے ساتھ تمہارے ملک کی حکومت کو پیش کر دی جائے گی۔ گڈ بائی.....!"

گڈھے میں گرا ہوا آدمی نا امیدی سے کراہنے لگا۔ اب دھوپ تیز ہو چلی تھی۔ سورج سر پر آ گیا تھا۔ اس کے سارے بدن میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ اور چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ اور کہیں کوئی سایہ نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی کھوپڑی چٹخ جائے۔ گڈھے میں گرے ہوئے آدمی نے اپنی کنپٹیوں کو دونوں ہاتھوں سے داب لیا۔ اور زور زور سے کراہنے لگا۔

ایک آواز آئی: "کیوں روتے ہو بچہ؟"

گرے ہوئے آدمی نے کراہنا بند کر کے اُوپر دیکھا۔ اوپر ایک جٹادھاری سادھو کا چہرہ نظر آیا۔

"سادھو مہاراج!" وہ رو کر بولا "میں گڈھے میں گر گیا ہوں۔ کسی طرح مجھے اس گڈھے سے باہر نکالیے۔"

"بھولے بچے!" سادھو مہاراج ہنس کر بولے "کتنے نادان ہو تم! اس چھوٹے سے گڈھے سے نکل کر باہر کے بڑے گڈھے میں گرنا چاہتے ہو۔ ارے احمق! یہ ساری دنیا ہی ایک بہت بڑا گڈھا ہے۔ اور ہر شخص ایک گڈھے میں ہے۔ کوئی چھوٹے میں کوئی بڑے میں۔ اس گڈھے سے رہائی کسی منش کے بس کی بات نہیں۔ اس گڈھے سے رہائی تجھے صرف بھگوان دلا سکتے ہیں۔"

"بس ذرا اپنے ہاتھ کا سہارا دے دو۔" وہ گڑگڑا کر بولا "میں تمہارا سہارا پا کر اوپر سڑک پر آ جاؤں گا۔"

"کیا سڑک کیا گڈھا، کیا موری کیا کھمبا، سب برابر ہیں۔ یہ سارا جگت متھیا ہے، مایا جال ہے۔" سادھو مہاراج دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے "ہم تو جاتے ہیں سیدھے ہردوار کو، تمہیں گڈھے سے نکالنا ہمارے بس میں نہیں۔ اتنا آشیرباد ضرور دیتے ہیں کہ بیٹا جہاں رہو سکھی رہو۔"

سادھو مہاراج کے چلنے کے بعد دو آدمی اور آئے۔ ایک نے کہا۔

"یہی وہ گڈھا ہے؟"

"ہاں ہے تو یہی" دوسرا بولا "مگر بہت بڑا ہے۔"

"اور اس میں ایک آدمی بھی گرا ہوا ہے۔" پہلا بولا۔

دوسرا بولا "اور اس وقت تک اس گڈھے کو نہیں بھرا جا سکتا جب تک اس آدمی کو گڈھے سے نہ نکالا جائے۔"

"اور جب تک نہ نکالا جائے۔ گڈھا بھرا نہیں جا سکتا" پہلا بولا

"مگر ہمارے پاس آدمی کو باہر نکالنے کا ٹائم نہیں ہے۔" دوسرا بولا

"اور گڈھے کو بھرنے کا ٹائم بھی نہیں ہے۔"

"اور منسٹر صاحب کی سواری دس منٹ بعد ادھر سے گزرنے والی ہے۔"

"تو اب کیا کریں؟"

"مجھے گڈھے سے باہر نکالو" گڈھے میں گرا ہوا آدمی کمزور آواز میں چلایا۔

"چپ بے، بکواس بند کر!" پہلا بولا۔ "جلد ہی وزیر صاحب کی سواری ادھر سے گزرنے والی ہے۔ اس لئے جہاں پڑا ہے وہیں دم سادھے پڑا رہ۔ ایک لفظ بھی بولا تو کھوپڑی توڑ دوں گا۔"

گڈھے میں گرا ہوا آدمی سہم کر چپ ہو گیا۔ وہ دونوں آدمی گڈھے

کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ آخر ایک بولا" وہ اُدھر نئی بلڈنگ کے نیچے لکڑی کے تختے زمین پر پڑے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ انھیں لا کر اس گڈھے پر بچھا دیتے ہیں۔ جب وزیر صاحب کی سواری گزر جائے گی۔ اُٹھا کر وہیں رکھ دیں گے۔"

چنانچہ یہی کیا گیا۔ گڈھے میں گرے ہوئے آدمی کے سر پر لکڑی کے تختے رکھ دیئے گئے۔ جب وزیر صاحب کی سواری گزر گئی۔ تو لکڑی کے تختے اُٹھا کر واپس پہنچا دے گئے۔

(اب میں وزیر صاحب نے بیان دیا۔ سڑک پر کوئی گڈھا نہیں تھا۔ میں نے کہیں کوئی گڈھا نہیں دیکھا۔ سڑک بہت صاف ستھری ہے۔ یہ شکایت کرنے والے سرکار کو بدنام کرنے کے لئے ایسا کہتے ہیں۔)

سہ پہر ڈھلنے لگی۔ سائے لمبے ہونے لگے۔ ہوا میں ایک خوشگوار خنکی آگئی۔ لوگ عمدہ کپڑے پہنے چہل قدمی کے لئے نکلنے لگے۔ اتنے میں ایک نوجوان چار پانچ دن کی شیو بڑھائے، تنگ مہری کی پتلون پہنے شانوں تک بال بکھرائے، گڈھے کے قریب آیا۔ نیچے جھک کر دیکھنے لگا، دیکھ کر ہنس دیا۔ پھر وہ نوجوان بہت اطمینان سے گڈھے کے کنارے بیٹھ گیا۔ اور اُس نے اپنے دونوں پاؤں نیچے گڈھے میں لٹکا دیے۔

گڈھے میں گرے ہوئے آدمی کے دل میں اُمید کی ایک جھلک پیدا

ہوئی - اُس نے آہستہ سے کہا "اے نوجوان مجھے گڈھے سے نکال"

"میں ایسا نہیں کر سکتا" وہ نوجوان انکار میں سر ہلا کر بولا "اگر ایسا کروں گا تو میرے ادب میں جذباتیت پیدا ہو جائے گی - اور ممکن ہے مقصدیت بھی پیدا ہو جائے اور مجھے ان دونوں سے نفرت ہے"

"تو کون ہے اے نوجوان؟" گرے ہوئے آدمی نے اُسے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا -

"میں؟ ---- میں نظم جدید کا شاعر ہوں! ---- میں وہ شاعری کرتا ہوں جو آج سے ایک سو برس بعد آنے والی ہے میرا مجموعۂ کلام آج ہی چھپا ہے - "اندھیرے کا سویرا" کیسا نام ہے - تجھے اپنے مجموعۂ کلام کی ایک جلد دیئے جاتا ہوں - گڈھے میں بیٹھ کر اسے جی لگا کر پڑھنا"

اتنا کہہ کر شاعر نے اپنے تازہ مجموعۂ کلام کی ایک جلد گڈھے میں پھینک دی - اور کافی ہاؤس چلا گیا -

دن ڈھل گیا - شام بھی ڈھل گئی - رات آ گئی گڈھے میں گرے ہوئے آدمی کو وہ گڈھا بہت بھیانک اور تاریک معلوم ہونے لگا - دور کہیں کہیں مدھم سی روشنیاں جھلملا رہی تھیں - کبھی کبھی کسی موٹر کے گزرنے کی آواز آتی موٹر اُس کے سر سے گزر جاتی اور وہ کانپتا ہوا رہ جاتا - اب سردی سے اُس کا سارا بدن ٹھٹھر رہا تھا - اور گھٹنوں تک کیچڑ میں کیڑے سے کلبلاتے

ہونے محسوس ہو رہے تھے۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے اُس کا ذہن ماؤف ہوا جا رہا ہے۔ ہوش و حواس جواب دے رہے ہیں۔ یکایک اُس نے اپنے سر کے اُوپر ایک سایہ سا دیکھا۔

ایک عورت پھٹی ساڑی پہنے، بال بکھرائے، وحشت کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ وہ اُس کے قدموں میں پڑا تھا۔ اور وہ نہیں جانتی تھی کہ اُس کے قدموں میں کیسا خطرناک گڑھا ہے۔

یکایک اُس نے اپنی بیوی کو پہچان لیا۔ اور پہچانتے ہی اُس کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اُس نے اپنی بیوی کو نام لے کر پکارا۔

وہ عورت چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ جیسے جاننا چاہتی ہو یہ یہ آواز کدھر سے آرہی تھی۔

"میں یہاں ہوں" وہ زور سے چلایا "یہاں نیچے گڑھے میں!"

وہ عورت گڑھے میں جھک گئی۔

وہ خوشی سے کانپتے ہوئے لہجے میں اپنی بیوی کا نام لے کر بولا۔ "ذرا ہاتھ نیچے کرو۔ میں تمہارے ہاتھ کا سہارا لے کر اُوپر آجاؤں گا"

عورت نے خوشی کے آنسو پونچھ کر اپنا ہاتھ نیچے جھکا دیا۔ گڑھے میں گرے ہوئے آدمی نے اپنی بیوی کا ہاتھ تھام کر اوپر آنے کے زور لگایا، تو اُس کی بیوی بھی پھسل کر گڑھے میں جا گری۔

دس سال بعد میرا اُس سڑک سے گزر ہوا۔ سڑک کی حالت پہلے سے بدتر ہو چکی تھی۔ اور وہ گڈھا بھی اب تک وہیں موجود تھا۔ ہم لوگ ایک جلوس کی صورت میں چل رہے تھے۔ ہمارے ہاتھوں میں اونچے اونچے جھنڈے تھے۔ جن پر لکھا تھا "ہمیں روٹی دو۔ کپڑا دو۔ محنت کا صلہ دو۔ ایسی شاعری دو جو سمجھ میں آتی ہو۔ ایسا نظام زندگی دو۔ جس میں محبت ہو، اور ہمدردی ہو۔ ایسے حاکم دو جو ہمارے ساتھ فیس کے کیو میں کھڑے ہو سکیں۔"

ہم لوگ جھنڈے اُٹھائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے کہ سڑک کے بیچ میں وہ گڈھا آگیا۔ اور ہم اُس کے کنارے رک گئے اور حیرت سے گڈھے کے اندر دیکھنے لگے۔

گڈھے میں گرا ہوا آدمی اب تک وہیں تھا۔ اُس کی بیوی بھی وہیں تھی۔ اس عرصے میں اُن کے ہاں دو بچے بھی پیدا ہو گئے تھے۔ اور وہ اس کیچڑ، بدبو اور گندگی میں انسان نہیں معلوم ہوتے تھے۔ خوفناک قسم کے مینڈک یا کچھوے سے معلوم ہوتے تھے۔

یکایک بہت سے ہاتھ نیچے گڈھے کی طرف بڑھ گئے۔

"آؤ، آؤ، اُوپر آؤ، گڈھے سے نکل آؤ۔ ہمارے ساتھ چلو!" میں نے کہا۔

مرد کی آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئیں۔ اُس نے ایک بچے کو اپنے ہاتھوں

میں چھپا لیا۔ دوسرا بچہ عورت نے اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ سہم کر بولی۔
"نہیں۔ نہیں۔"

میں نے گڑھے میں گرے ہوئے آدمی سے کہا "ہم تمہیں گڑھے سے باہر نکالنے کے لئے آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ چلو۔ دیکھو اوپر ہوا کتنی تازہ ہے۔ زندگی کتنی وسیع ہے، آسمان کس قدر کھلا ہے۔ آؤ ہمارے ساتھ مل کر ایک بہتر زندگی کے لئے جدوجہد کرو۔"

اُسے سہارا دینے کے لئے ہمارے ہاتھ اور نیچے گئے۔ وہ اُس کی عورت اور اُس کے بچے گڑھے کے فرش پر سکڑ کر بیٹھ گئے

یکایک، اُس گڑھے میں گرے ہوئے آدمی نے سر ہلا کر کہا۔
"تم جاؤ۔ میرے لئے یہی گڑھا کافی ہے۔ اب میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ گڑھے میں اس سڑک سے مجھے آرام بہت ہے۔"

مُبارک ہیں قاتل

ابوطاھر کا تنگ، نیم تاریک، سیلا ہوا کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ رمی چل رہی تھی، اور بھٹر اچل رہا تھا اور رُک رُک کر پتے پھینکنے والوں کے ہاتھ چل رہے تھے۔ زیدی ہولے ہولے گنگنانے لگا۔

مبارک ہیں قاتل

جو اپنے جذبات کو ادا کرنے کی قوّت رکھتے ہیں۔

مبارک ہیں جو ۔۔۔۔۔

ابوطاہر خفا ہو کر کہنے لگا "سناتے ہو تو کوئی غزل سناؤ۔ تمہاری یہ جدید نثریہ شاعری اپنے پلے نہیں پڑتی!"

ٹھنگنا زیدی گورکھپور کا رہنے والا تھا، جس شہر نے فراق اور مجنوں ایسے باکمال ادیب پیدا کئے۔ زیدی بھی ایک شاعر تھا۔ وہ فلموں میں گیت لکھتا تھا۔ اور نثریہ شاعری کرتا تھا۔ دو سال ہوئے وہ اپنی بیوی اور دو بچے چھوڑ کر گورکھپور سے بمبئی چلا آیا تھا۔ دو سال میں اسے پانچ فلمی گیت لکھنے کو ملے اور کل معاوضہ سات سو روپے ملا۔ پہلے اس کی بیوی کے خط باقاعدگی سے آتے تھے اور وہ باقاعدگی سے جواب دیتا تھا، پھر جب وہ تسلی دیتا دیتا تھک گیا تو اس نے اپنی بیوی کو جواب دینا بند کر دیا مگر اس کی بیوی کے خط برابر آتے رہے، پھر اس نے ان خطوں کو پڑھنا بھی بند کر دیا۔ پھر انہیں کھولنا بھی بند کر دیا پھر بیوی کے خط آنے بند ہو گئے۔ اب گزشتہ سات ماہ سے زیدی کے پاس اپنی بیوی کا ایک بھی خط نہیں آیا تھا۔ مگر زیدی کے بستر کے نیچے اس کی بیوی کے ان کھولے ہوئے خطوں کا ایک پلندہ ایک پرانے آزار بند سے بندھا ہمیشہ پڑا رہتا تھا۔

"ایک دن میں انھیں کھولوں گا" زیدی اکثر کہتا اور ہاتھ میں

خطوں کا پلندہ لے کر اسے تولنے کی کوشش کرتا۔ شاید وہ اٹکل سے یہ اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ کہ ان خطوں کے اندر غم کا کتنا بوجھ دفن ہے!

"سو جاؤ میری پیاری بیوی" وہ پیار سے ان خطوں کو تھپتھپاتے ہوئے اپنے تکئے کے نیچے رکھ دیتا۔

مجھے زیدی کی اس حرکت پر بڑا غصّہ آتا تھا اکثر میں جھلّا کر اس سے کہتا تھا "تو نے کبھی سوچا ہے تیری بیوی کا کیا ہوا ہوگا۔ تیرے دو بچوں کا؟"

زیدی کی آنکھوں میں عجیب سی مسکراہٹ تیرنے لگتی اور وہ دھیرے دھیرے کہتا۔

مبارک ہیں وہ بوجھ خلنے
جن میں یتیم پلتے ہیں

"تو شعر کیوں نہیں کہتا؟" میں نے اس سے پوچھا
"اور ہر وقت اپنی داڑھی کیوں توڑتا رہتا ہے؟"

زیدی جب تاش کے کھیل میں منہمک ہوتا، تو رہ رہ کر اپنی ڈاڑھی کے بال توڑنے لگتا تھا۔ بالوں کو موڑتے موڑتے وہ ایک زور کا جھٹکا دیتا اور ایک بال نکال کر لاتا، چند لمحوں کے لئے اس کا چہرہ کرب و تشنج میں ڈوب جاتا تھا۔ پھر وہ پتہ چلتا تھا۔

میں اس لئے شعر نہیں کہتا کہ شعروں سے آج کل کسی کو تکلیف نہیں ہوتی، اور ڈاڑھی اس لئے توڑتا ہوں کہ اس عمل سے کم سے کم مجھے تو تکلیف ہوتی ہے۔" زیدی نے جواب دیا۔

"اچھا وہی ایک بار پھر سناؤ، — مبارک ہیں قاتل" ایک آواز آئی۔

یہ منوہر تھا۔ دُبلا اور بھوکے چہرے والا۔ اس کا جسم چاقو کے پھل کی طرح دراز اور نوکیلا تھا۔ اور ہر لحظہ اس طرح مضطرب نظر آتا تھا جیسے اسے بخار چڑھا ہو۔ اس کی آنکھیں ہر وقت سوئی سی دکھائی دیتیں۔ لیکن اس کے بازوؤں میں بجلی کی سی لپک تھی، اپنی چنڈال چوکڑی میں ہر شخص اس کی عزت کرتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک پیشہ ور قاتل تھا گو اس کے اپنے پیشے کی تفصیلات سے ہمیں کبھی آگاہ نہیں کیا تھا۔ لیکن ہم سب جانتے تھے۔ جس طرح سے وہ ہر وقت سلگتا رہتا تھا، کبھی کھیلتے کھیلتے اچانک چوکنا ہو جاتا اور سب لوگ دم بخود چور نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگتے۔ ان تمام باتوں سے ہم سب اس کی عزت کرتے تھے۔ کبھی کبھی جب وہ ترنگ میں ہوتا تو کہا کرتا "اس سے بہتر پیشہ ممکن نہیں ہے۔ پوری رقم ایڈوانس میں ملتی ہے، ادھار کا سوال ہی نہیں اور کام ہمیشہ ملتا ہے،" اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم میں سے اکثر لوگ اکثر بیکار رہتے تھے، مگر منوہر کو ہمیشہ کام ملتا تھا۔

کبھی کبھی وہ ہمیں ڈرانے کے لئے اپنا چاقو کھول لیتا تھا۔ میرے لئے اس کا چاقو اپنے اندر بے پناہ دہشت کا اثر رکھتا تھا۔ ایک بار میں نے اس کے پھل کو کھول کر اس کی دھار کو آزمایا تھا۔ سارے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی تھی۔

"تمہیں گناہ کا احساس نہیں ہوتا؟" میں نے اس سے ایک بار پوچھا تھا۔

"گناہ کا احساس تو وہاں ہوتا ہے جہاں کوئی جذبہ ہوتا ہے یا رشتہ ہوتا ہے۔" اس نے بہت سوچ کے مجھے جواب دیا تھا "میرے لئے تو وہ لوگ بالکل اجنبی ہوتے ہیں، زیادہ سے زیادہ ایک نشانہ ہوتے ہیں، کئی بار تو مجھے ان کی صورت بھی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ کیونکہ میں اکثر پیچھے سے حملہ کرتا ہوں چاقو کے دو وار، ایک آڑا دوسرا ترچھا اور خلاص!"

وہ بارہ برس کی عمر کا تھا جب بمبئی آیا تھا، اپنی نو برس کی ایک بہن کو لے کر اس کے ماں باپ اور دو بڑے بھائی ۱۹۴۷ء کے فسادوں میں مارے گئے تھے، اپنی آنکھوں سے اس نے فسادیوں کو چاقو استعمال کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ تب سے چاقو کے لئے اس کے دل میں ایک عجیب سی کشش پیدا ہو گئی تھی۔ اب اس کی بہن فارس روڈ پر طوائف تھی اور اس کی جیب میں ایک چاقو تھا۔

زیدی دوبارہ سنانے والا تھا کہ گیسٹ ہاؤس کا بیرہ اندر آیا اور بولا " وہ پھر آئی ہے !۔"

بیرے کا اشارہ کیلاش کی طرف تھا کیلاش کا چہرہ ایک بچے کی طرح تھا۔ اور جسم ایک سپاہی کا سا تھا، شروع میں جب اسے کہیں کام نہ ملا۔ تو وہ فوج میں بھرتی ہو گیا تھا مگر وہاں سے کسی غلطی کی بنا پر نکال دیا گیا جب سے وہ بیکار تھا بمبئی کے مقناطیس نے اسے بھی کھینچ لیا تھا، کیلاش بیحد طاقتور اور پھرتیلا تھا۔ اور مدت سے منوہر کی نظر اس پر تھی، اسے کیلاش ایسا ساتھی اگر مل جائے تو پھر کیا نہ ہو ؟ وہ سوچتا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے کئی بار کیلاش کو اشارہ بھی کیا تھا۔ مگر کیلاش کو زندگی میں شدید دلچسپی تھی اس لئے وہ موت کے پیشے کو اختیار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ اور اپنے بڈھے ماں باپ کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ایک جوان بہن تھی، وہ اس کی اچھی جگہ شادی کرنا چاہتا تھا اور اس کے چھوٹے بھائی تھے، ارادہ تھا کہ وہ ان دونوں کو انجنیئر بنا کے رہے گا۔ اس کے سپنے بہت وسیع کھلے اور خوش رنگ تھے۔ اور ان میں منوہر کے چاقو کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔

مگر چند دن سے کیلاش بہت اُداس رہتا تھا۔ سات دن ہوئے اس کی ماں کا خط اس کے پاس آیا تھا۔ اس کا باپ خطرناک طور پر بیمار ہو کر ہسپتال میں رکھ دیا گیا تھا۔ جلد سے جلد آپریشن کی ضرورت تھی، ورنہ ممکن ہے اس

کا باپ نہ بچے۔ اس کی ماں نے اس سے پانچ سو روپے طلب کیے تھے اور کیلاش ابھی تک کوئی انتظام نہیں کر سکا تھا۔ وہ اور ابو طاہر دونوں نرائن سنگھ اینڈ کو ہاؤس ایجنٹ کے کارندے تھے اور دن بھر کرائے داروں کو خالی مکان، دکھا دکھا کر جوتیاں چٹخاتے تھے۔ جب کبھی سودا پکا ہو جاتا، تو ہاؤس ایجنٹ تو اپنے کمیشن کے کئی سو کھرے کر لیتا مگر ابو طاہر اور کیلاش کو پانچ دس پر ہی ٹرخا دیتا۔ ابو طاہر تو اکیلا تھا، اس لئے پانچ دس پر ہی خوش ہو جاتا، مگر کیلاش کے ارادے بہت بلند تھے، وہ اکثر دانت پیس کر کہتا "میں اس بدمعاش کو ایک دن دکھا دوں گا سمجھتا کیا ہے گاہک ہم گھیر کر لائیں۔ مالک مکان کو ہم راضی کریں، دن رات جھوٹ بول کر سودا ہم پکا کریں اور ساری بالائی نارائن سنگھ کھا جائے۔ دیکھ لینا ابو طاہر ایک دن میں تم کو اس بمبئی میں ہاؤس ایجنٹ بن کر دکھا دوں گا۔ باندرے سے اندھیری تک کے سارے فلیٹ میرے ٹھیکے میں ہوں گے۔ اور میں اپنے بڈھے ماں باپ کو چھ کمرے والے نئے فلیٹ میں رکھوں گا۔ پالی ہل روڈ پر میں نے فلیٹ بھی دیکھ لیا ہے!"

بیرے کی آواز سن کر کیلاش چونکا، پتے پھینک کر کیلاش فوراً اٹھا

ابو طاہر بولا "ٹھرا ختم ہے، چار بوتلیں لیتے آنا"

کیلاش نے اپنے دونوں ہاتھ جھاڑ دیئے "اپنے پاس تو ایک پائی بھی

نہیں ہے۔ سب ہار گیا۔"

میں بھی کیلاش کے پیچھے پیچھے اُٹھا۔ کیونکہ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے جو پھر آئی ہے؟

کیلاش ایک چھوٹے سے گندے کوریڈور سے مڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ جو گیسٹ ہاؤس کی تیسری منزل پر کچن اور باتھ روم کی ٹنکیوں سے ملحق تھا۔ لوہے کی لمبی لمبی پائپوں سے لگی ہوئی اندھیرے میں کھڑی ایک لڑکی کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو میں نے دیکھ لیا۔ اس کے نیلے پھول دار ساڑے کا ایک حصہ لہراتا ہوا نظر آیا۔ پھر کیلاش اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور میں چند قدم ادھر اندھیرے میں کھڑا ان کی باتیں سننے لگا۔

"میں نے تم کو بول دیا۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تو تم پھر کیوں آئی ہو؟" کیلاش کہہ رہا تھا۔

"ہم تو تم کو لو کرتا" لڑکی آواز آئی "LOVE"

"لو کرتا اور پچاس روپے بھی مانگتا؟" کیلاش نے پوچھا

"ہاں لو کرتا اور پچاس روپے بھی مانگتا۔ ہم دو رات تمہارے سنگ رہا۔ تو تم ہم کو پچاس روپے بھی نہیں دے گا؟ ہم کالج گرل ہے: "

"تم کیسا کالج گرل ہے، دھندا کرتا؟"

"پڑھنے کے واسطے!"

دیر تک کیلاش خاموش رہا۔ دیر تک کچن سے مچھلی کی سڑی ہوئی بُو آتی رہی پھر اس لڑکی کی سسکتی سی آواز آئی۔ "ہم بھوکا ہے۔"

"تم بھوکا ہے تو ہم کیا کرے گا؟" کیلاش نے غصّے سے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "ادھر چھ مہینے سے میں نے گیسٹ ہاؤس کا بھاڑا نہیں دیا ہے۔ مالک نے بجلی کاٹ دی ہے کھانا دے۔ مجھے نہیں کھلاتا۔ تو میں تمہیں کہاں سے کھلاؤں گا؟"

"تو ہمارے پچاس روپے دے دو۔ ہم جاتا ہے۔ تم نے ہم کو حیران کر رکھا ہے۔ تم صبح بلاتا ہے، ہم صبح آتا ہے، تم شام کو بلاتا ہے، ہم شام کو آتا ہے۔ دیکھو ہمارا کھوٹی مت کرو۔ نہیں تو ــــــ

"نہیں تو کیا؟" کیلاش نے گرج کر پوچھا۔

"نہیں تو ہم اِدھر دھرنا دے کر بیٹھے گا۔ تمہارے کمرے کے سامنے!"

"تو بیٹھی رہو۔ ہم کو پرواہ نہیں ہے!"

کیلاش وہاں سے مڑنے لگا تو لڑکی نے کیلاش کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولی "اگر تم ہم سے شادی بنائے گا تو ہم پچاس روپے چھوڑ دے گا۔ اور ساری زندگی تمہاری خدمت کرے گا!"

لڑکی کی آواز میں ایک عجیب سی التجا تھی، جیسے نیلے پانیوں میں اُگی ہوئی دریائی گھاس کے نرم نرم خوشے پاؤں سے اُلجھ جاتے ہیں اُسی

طرح وہ آواز میرے دل سے الجھنے لگی اور میں نے محسوس کیا کہ کیلاش بھی بہت دیر تک خاموش رہا، اور اس خاموشی کی پھیلی ہوئی سطح پر مجھے اس لڑکی کی آواز ایک ڈوبتے ہوئے بچے کی طرح ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"اری پگلی!" ---- اور اب کیلاش کا لہجہ بہت نرم تھا۔ "میرے پاس تو کھانے کو بھی پیسے نہیں ہیں، میں شادی کیسے کر سکتا ہوں۔ دیکھ لزا اس وقت تو چلی جا میں وعدہ کرتا ہوں جونہی مجھے پیسے ملے سب سے پہلے میں تیرا بل چکا دوں گا!"

"اچھا مجھے آج دس روپے ہی دے دے!"

"دس بھی نہیں ہیں!"

"تو پانچ ہی دے دے!"

"پانچ بھی نہیں ہیں!"

"تو دو ہی دے دے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ کیلاش سوئٹ ہارٹ!"

"اس وقت میری جیب میں ایک اٹھنی بھی نہیں ہے۔" کیلاش کی کی آواز میں انتہائی مجبوری تھی۔

"تو میں رات بھر تمہارے کمرے کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھے گا" لزا نے مصمم ارادہ سے کہا۔

بیٹھتی ہو تو بیٹھی رہو اسے مجھے کیا؟" کیلاش نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

وہ بالکل قریب سے میرے پاس سے گذر گیا مگر اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ جب لڑکی اس کے بند کمرے کے سامنے ایک ٹھنڈی سانس لے کر بیٹھ گئی تو میں بھی وہاں سے چلا آیا۔

مگر کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ کمرے کی فضا بھی بدل ہوئی ہے۔ سب سے پہلے میں نے دیکھا کہ کمرے میں بجلی آ گئی ہے۔ یہ بجلی چار ماہ سے کٹی ہوئی تھی۔ کیونکہ ہم میں سے کسی نے گیسٹ ہاؤس کے مالک کو بجلی کا بل ادا نہیں کیا تھا موم بتیوں سے کام چلاتے تھے، اچانک بجلی کیسے آ گئی خود بخود!"

معلوم ہوا کپاہی نے تیسری منزل کے کرائے داروں کے بجلی کے سب پیسے چکا کر گیسٹ ہاؤس کے مالک سے تیسری منزل کا سوئچ آن کرا لیا تھا

کپاہی بھورے رنگ کا آدمی تھا معلوم ہوتا تھا مٹی تھوپ کر بنایا گیا ہے، کچھ ایسی ہی سوندھی سوندھی سی خوشبو اس کے جسم سے آتی تھی اس وقت وہ بہت خوش تھا۔ وہ سٹنٹ فلموں کا پروڈیوسر تھا آج ایک ڈسٹری بیوٹر محض دھیلی میں اسے ڈھائی ہزار کا ایڈوانس دے گیا تھا وہ رقم اس کی جیب میں تھی۔

کپاہی نے پچاس روپے نکال کر بیرے کو دیئے بولا "سب کے لئے ایک ایک بوتل ٹھرا لاؤ، مرغ لاؤ، مچھلی لاؤ، کلیجی لاؤ، جو جس کو مانگتا ہے لاؤ!"

جب بیرا چلا گیا تو کپاہی نے سب سے پہلے ڈھائی سو روپے الگ نکال کر منوہر کو دیئے "تمہارا قرضہ بے باق ہے۔" اس نے پوچھا

"ہاں بے باق ہے" منوہر نے بڑی لاپرواہی سے رقم جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم سے کتنے لئے تھے؟" کپاہی نے مجھ سے پوچھا

"آجائیں گے" میں نے کمزور لہجے میں کہا۔ حالانکہ میں کہنا چاہتا تھا اسی روپے!

"یہ لو اسی روپے" کپاہی نے مجھے اسی روپے گن کر دے دیئے۔

پھر اس نے ابو طاہر کو ایک سو پچاس روپے دیئے اور پھر ایک سو پچاس روپے دے کر کہا "تم بھی عیش کرو!"

کیلاش مفت میں ایک سو پچاس روپے پاکر خوشی سے اچھلا، اور ٹارزن کی طرح اس نے زور کی ایک چیخ ماری۔ پھر اس نے کہا "ابھی آتا ہوں" اور دوڑتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں بھی اس کے پیچھے گیا۔

کیلاش نے چاکر لزا کو پچاس روپے دیئے۔ لزا پچاس روپے لے کر اس کا منہ چومنے لگی "سویٹ ہارٹ!"

کیلاش نے اس کے لئے اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا اس کمرے میں وہ اور کپاہی دونوں اکٹھے رہتے تھے، کیلاش نے اسے کپاہی کا خالی پلنگ دکھاتے ہوئے کہا "تم چاہو تو آج اس پلنگ پر سو سکتی ہو!"

"تو کپاہی کہاں جائے گا؟"

"وہ کسی دوسرے کمرے میں سو رہے گا!"

"ڈارلنگ۔ آئی لو یو!"

یکایک لزا کی آواز میں اتنی مٹھاس کہاں سے آگئی تھی۔

کیلاش نے واپس آکر کپاہی سے کہا "مجھے پانچ سو روپے چاہئیں، جب میں ہاؤس ایجنٹ بن جاؤں گا تمہیں واپس کردوں گا۔"

"ساری۔" کپاہی بولا۔ "میں نے گیسٹ ہاؤس کے مالک کو تیرہ سو روپے ادا کئے ہیں، ورنہ ———"

"مت دو، کوئی مضائقہ نہیں" کیلاش بولا۔

"یہی رقم میں رمی میں تم سے جیت سکتا ہوں۔ چار آنہ پوائنٹ کھیلتے ہو؟"

"کھیلوں گا۔" کپاہی نے اس کا چیلنج قبول کرتے ہوئے کہا۔

رات بھر رمی چلتی رہی، اور بھرا چلتا رہا اور رات چلتے رہے اور ریت کی گھڑی کے ذروں کی طرح کیلاش کی تقدیر لمحہ بہ لمحہ کھسکتی رہی۔ کوئی تین بجے کے قریب وہ سب پیسے ہار چکا تھا۔ اور ابو طاہر بھی، صرف منوہر نے پیسے بنا لئے تھے؛

غصے سے جھلا کر کیلاش نے پتے زمین پر پھینک دیئے۔ "میں نہیں کھیلتا۔" کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

صبحدم ایک تار والا ایک تار لے کر آیا تھا، کیلاش کے لئے۔ اس تار کو پڑھ کر ہم میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ کیلاش کو جگایا جائے۔ بہت دیر تک جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ہم سب نے مل کر کیلاش کو وہ تار دینے کی ٹھانی، چنانچہ میں اور زیدی اور منوہر اور ابو طاہر، اس کے دروازے تک گئے۔ اور دھیرے سے اسے کھٹکھٹانے لگے۔

دو تین کھٹکوں کے بعد کیلاش نے دروازہ کھول دیا۔ وہ دروازے میں مادر زاد ننگا کھڑا تھا۔

"کیا ہوا؟"

"حرامزادہ کیا ہی میرے کپڑے پہن کر چلا گیا ہے۔" کیلاش بولا "اور میرے پاس کوئی دوسرا جوڑا بھی نہیں ہے۔"

"کیوں پہن کر چلا گیا؟" میں نے اس سے پوچھا

"میری پینٹ قمیص ذرا صاف ستھری تھی۔ اس کی بہت میلی تھی"
کیلاش نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔" اب جیب تک کپا ہی واپس نہ آ جائے
مجھے دن بھر اسی طرح اپنے کمرے میں بیٹھا پڑے گا۔ کیونکہ وہ اپنا جوڑا
لانڈری میں دے گیا ہے۔"

پھر وہ اسی طرح ننگ دھڑنگ، آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھ گیا۔
آؤ رمی کھیلیں، ٹھرا پئیں!"

"ٹھرا کہاں سے آئے گا؟" زیدی نے پوچھا

وہ کیلاش فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے پلنگ پر لزا مدہوش سو رہی
تھی۔ کیلاش نے آہستہ سے اس کی باؤز میں دو انگلیاں ڈال کر نوٹوں کی گڈی
کھسکائی۔ لزا کو کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ بڑے آرام سے سوتی رہی۔ پچاس میں
سے تیس روپے ابو طاہر کو دے کر کہا۔

جیسے کیلاش نے سنا ہی نہ ہو۔ وہ ابو طاہر سے مخاطب ہو کے بولا۔
"میرا منہ کیا دیکھتے ہو، جلدی سے لاؤ!"

جب بوتلیں آ گئیں، اور ابلے ہوئے انڈوں کی پلیٹیں رکھ دی گئیں
اور تاش کی بازی بٹ گئی تو کیلاش نے سب کے جام بھر دیئے۔ پھر اپنا
گلاس اُٹھا کر بولا۔ "بیو مرحوم کی یاد میں!"

"کیا کہتے ہو؟" میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ کیونکہ ٹیلی گرام

تو ابھی میری جیب میں تھا۔

"پیو" کیلاش گرج کر بولا۔" اس اُلّو کے پٹھے، حرامزادے، سوّر کے بچّے کی یاد میں، جس نے مجھے پیدا کیا۔ میری پرورش کی، اپنا پیٹ کاٹ کے مجھے پڑھایا۔ مجھے چھ فٹ کا یہ جوان بنایا، وہ جو ہسپتال میں ایڑیاں رگڑتا رگڑتا اس اُمید میں مر گیا، کہ اس کا بیٹا اسے پانچ سو روپے بھیج کر اس کی جان بچائے گا، پیو، پیو، کم بختو!... میرا منہ کیا دیکھتے ہو؟"

پھر وہ ہمیں بھی بے نقط سنانے لگا، مگر ہم سب لوگ اس کی گالیوں کی قطار کے سامنے سر جھکا کر خاموشی سے اپنا جام اُٹھاتے گئے پھر ہم سب نے اس کے ساتھ اپنے جام ٹکرائے اور ہونٹوں سے لگا کر یکبارگی خالی کر دیئے کیلاش نے فوراً ہی دوبارہ ہمارے جام بھر دیئے۔

پھر وہ ہم سب کو دیکھ کر منوہر کی طرف مڑا "۔ چاقو کدھر ہے؟"

منوہر نے چاقو نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا اور دوسرے ہاتھ سے کیلاش کا ہاتھ زور سے دبایا۔

کیلاش نے خفیہ کمانی دبا کر چاقو کھولا۔ اک ذرا سے کھٹکے سے چاقو کا چمکتا، لپلپاتا پھل ہماری آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا۔ کیلاش اک عجیب محویت کے عالم میں بڑے پیار سے اُس چاقو کے پھل پر ہاتھ

پھیرنے لگا۔

"نہیں نہیں" زیدی نے بڑی شدت سے انکار کیا۔ "ایسا مت کرو، منوہر سے ہاتھ مت ملاؤ!"

وہ سناؤ جو کل رات تم نے سنایا تھا۔" کیلاش نے اس سے کہا۔

"نہیں نہیں" زیدی نے بڑی شدت سے انکار کیا۔ "میں نہیں سناؤں گا۔"

"سناؤ" کیلاش نے گرج کر مطالبہ کیا اور اس کا ہات چاقو کی مٹھی پر مضبوط ہوتا گیا۔ منوہر کے چہرے پر مسرت کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ آگئی!

زیدی بھولے ہوئے سنانے لگا۔

مبارک ہیں قاتل

کہ اپنے جذبات کو ادا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں

مبارک ہیں چور

کہ اپنا مال دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں

مبارک ہیں طوائفیں

کہ وہ بیویاں نہیں ہیں

جن کے جسم ہر رات

اپنے شوہروں سے جھوٹ بولتے ہیں

مبارک ہیں بوچڑ خانے
جن میں یتیم پلتے ہیں
آرزو مند اس یوم بہار کے
جس دن وہ ذبح کئے جائیں گے
مبارک ہیں احمق
جو ہر ملک میں
خودکشی کو ووٹ دیتے ہیں
اُس کی آواز میں ایسا دُکھ تھا جیسے ہم سب ایک باپ کے ساتھ
اس کے بیٹے کی لاش کو بھی سپردِ خاک کرتے جا رہے ہوں!

گنجا

کچھ لوگ پیدائشی بیوقوف ہوتے ہیں کچھ لوگ پیدائشی گنجے ہوتے ہیں۔ میرا نام دوسری فہرست میں آتا ہے مگر بعض لوگ مصر ہیں کہ میرا نام دونوں فہرستوں میں ہونا چاہیئے، بہرحال میں گنجا ہوں ہمیشہ سے گنجا تھا ہمیشہ گنجا رہوں گا۔ دراصل گنجا ہونے میں ایک خوشگوار قسم کی قطعیت ہے جو دوسرے حالات میں ممکن نہیں

افلاس آتا ہے اور چلا جاتا ہے دوست ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں دولت آتی ہے اور چلی جاتی ہے لیکن گنج جب آتا ہے تو پھر کبھی نہیں جاتا بدچلن سے بدچلن آدمی نیک طینت ہو جاتے ہیں احمق سے احمق آدمی زیرک بن سکتا ہے۔ لیکن گنجا آدمی کبھی دوبارہ بالوں والا نہیں بن سکتا موت کی طرح گنج کا بھی ایک وقت معیّن ہوتا ہے اور یہ مرض بھی موت کی طرح لاعلاج ہے۔

گو بازار میں اس مرض کو دور کرنے کے لئے سینکڑوں دوائیں فروخت ہوتی ہیں ہر روز اخبار اس قسم کے اشتہاروں سے بھرے ہوتے ہیں اور میرا اپنا تجربہ ہے کہ یہ دوائیں واقعی بڑی کارآمد ہوتی ہیں یہ دوائیں انڈے کی سطح پر بال اُگا سکتی ہیں کنگھی کو برش میں تبدیل کر سکتی ہیں لیکن گنجی چندیا پر بال نہیں اگا سکتیں۔ نہیں میرے دوستو! میرے گنجے ساتھیو۔ یہ قطعاً ناممکن ہے۔

اب تو میں اپنے گنج کا عادی ہو گیا ہوں جیسے پیدائشی کانا ایک آنکھ کا عادی ہو جاتا ہے لیکن اس دنیا کا کیا کیا جائے کہ کسی طرح جینے ہی نہیں دیتی ہر وقت ہر لمحہ کسی نہ کسی طرح سے یہ احساس دلائے رکھتی ہے کہ تم گنجے ہو میرے ایک دوست ہیں۔ جناب رام غوغاتی غاباتی کہ عمر میں مجھ سے پندرہ سال بڑے ہوں گے۔ بال سفید ہو گئے

لڑکا بی۔ اے میں پڑھتا ہے مگر مجھے میرے گنج کی وجہ سے بڑی کمینی مسرت سے ہمیشہ اپنا "بڑا بھائی" کہتے ہیں۔ ایک ہیں جناب کہ طولے تیزاری کہ شکل صورت سے دمے کے مریض دکھائی دیتے ہیں مگر وہ بھی مجھے "بڑھو" کہہ کر پکاریں گے اور اگر میں معترض ہوتا ہوں تو فوراً بات کا رخ بدل کر کہہ دیتے ہیں۔ "بھئی برا مت مانو ہم تو اس لئے آپ کو بڑا کہتے ہیں کہ آپ عقل ودانش میں ہم سب سے بڑے ہیں نہ جانے ان لوگوں نے عقل کو گنج سے کیوں باندھ دیا ہے (کس بال سے باندھا ہے وہ تو نظر نہیں آتا)

اکثر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جوں جوں بال گھٹتے ہیں عقل بڑھتی ہے پھر ایک وقت آتا ہے کہ ادھر سر کے بال غائب ہو جاتے ہیں اُدھر انسان کو عرفان حاصل ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں اس بات میں کہاں تک صداقت ہے۔ مگر غالباً اسی وجہ سے بھکشو، مولوی اور پنڈت ہمیشہ اپنا سر گھٹائے رکھتے ہیں ـــ تاکہ حقیقی طریقہ پر نہ سہی مصنوعی طریقہ ہی سے گنجے نظر آئیں دنیا میں میں نے ہی ایک فرقہ دیکھا ہے جس کے لئے گنج باعث فخر و مباہات ہے۔

میں چونکہ خود گنجا ہوں اس لئے عقل اور گنج کے درمیان جو رشتہ قائم کیا گیا ہے اسے کسی نہ کسی طرح سے صحیح سمجھتا ہوں کہ اس کے سوا

اور کوئی چارہ بھی نہیں۔

مگر صاحب گنجا آدمی بے وقوف نہ ہو۔ بدقسمت ضرور ہوتا ہے اب میں ایک خفیہ راز آپ کو بتاتا ہوں میرے آج تک کنوارے رہنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

جانے ان عورتوں کو ہم گنجے آدمیوں سے اس قدر نفرت کیوں ہوتی ہے۔ آپ کے پاس گاڑی ہے۔ تعلیمٔ ہے۔ بنک بیلنس ہے اچھی صورت ہے لیکن اگر آپ گنجے ہیں تو وہ کبھی آپ کو منہ نہیں لگائیں گی وہ آپ کے ڈرائیور سے شادی کرنے پر رضامند ہو جائیں گی لیکن آپ سے نہیں!

شروع شروع میں مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ جوان تھا جہاں بھر کی آسائشیں میسر تھیں۔ اس لئے بے فکر تھا لیکن جب عمر کے تیس برس پورے ہونے کو آئے۔ اور کہیں شادی کی بات پکی نہ ہوئی تو ذرا پریشان ہوا۔ ماں باپ نے کئی جگہ بات چھیڑی لیکن یہ چھیڑ چھاڑ ہمیشہ کچھ عرصہ کے بعد ختم ہو جاتی ماں باپ دبی زبان میں سرگوشی کرتے اور میری طرف اس حیرت سے دیکھتے جیسے آدمی تیسرے درجہ کے تپ دق کے مریض کو دیکھتا ہے پھر جب ماں باپ مر گئے تو بادل ناخواستہ میں نے خود چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ مگر نتیجہ وہی صفر۔ شروع کی دو تین ملاقاتیں

بہت اچھی رہتی تھیں۔ لڑکی سے دلچسپی کا اظہار کرتا۔ دلچسپی بڑھتے بڑھتے کشش تک پہنچ جاتی۔ نیم باز نگاہوں سے پیام ملنے بھی شروع ہو جاتے انداز گفتگو آپ سے تم اور تم سے ڈارلنگ تک آ جاتا۔ لیکن جس دن میری ٹوپی اترتی اور ایک نہ ایک دن اُسے اترنا ہی تھا۔ کیونکہ عشق اور گنج چھپائے نہیں چھپتے اس روز بد سے لڑکی کی دلچسپی مجھ میں یک لخت ختم ہو جاتی اس کے بعد وہ مجھ سے کبھی نہ ملتی کچھ عرصہ بعد مجھے خبر ملتی۔ کہ اس قتال عالم نے ایک ایسے مردوے سے شادی کر لی ہے جو نہ میری طرح خوبصورت ہے نہ امیر ہے نہ سرکاری ملازم ہے بلکہ کسی تیسرے درجے کے اخبار میں چوتھے درجے کا ایڈیٹر ہے بنک کا اکاؤنٹ خالی ہے مگر سر بالوں سے بھرا ہوا ہے۔

میں نے کئی عورتوں کو دیکھا ہے کہ مردوں کے بالوں کا ذکر کرتے ہوئے ان پر ہیجان بلکہ ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ "ہائے ری کل نمائش میں میں نے ایک آدمی کے بال دیکھے کس قدر خوب صورت بال تھے اس کے۔ سیاہ اور گھنے اور لانبے گھنگھریلے۔ ہائے ری میں تو مر مٹی اس پر جی چاہتا تھا اُسے اپنے پاس بلا کے اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دوں۔"

ایسی عورتوں کی گفتگو سُن کر ہمیشہ یہ خیال آتا ہے کہ ان کی شادی

کسی آدمی کی بجائے کسی گوریلے، یا بن مانس سے کردی جائے تو بہت خوش رہیں گی۔"

بالوں کی اس غیر معمولی پرستش کا ایک اثر یہ ہوا ہے۔ کہ بالوں والے حضرات جا و بیجا اترانے لگے ہیں میرے ایک دوست ہیں بمبئی میں رہتے ہیں قد چوہے کا سا شکل بھی چوہے کی سی۔ چال بھی ویسی سٹرک پر اس طرح گھبرائے ہوئے چلتے ہیں کہ ابھی کھڑ کا ہوا اور آپ بھاگ کر کسی بل میں گھس جائیں گے۔ مگر لڑکیاں ہیں کہ ہمیشہ انہیں گھیرے رہتی ہیں کیونکہ ان کے سر کے اوپر بال ہیں اور ویسے علا گھنے ہیں۔

اور یہ تو میں نے بھی دیکھا ہے واقعی ان کے سر کے بال اتنے گھنے گھنگھریالے ہیں کہ انتہائی گرمی کے دنوں میں بھی سورج کی کرنیں ان کی کھوپری تک نہیں پہنچ سکتیں برسات کے دنوں میں مون سون کی تیز ہوائیں بس ان کے بالوں کی اوپری سطح کو گیلا کرتی ہوئی گزر جاتی ہیں نیچے کا حصہ ہمیشہ سوکھا رہتا ہے۔

چنانچہ ان صاحب نے گرمیوں میں کبھی چھتری استعمال نہیں کی برسات میں کبھی رین کوٹ نہیں خریدا کہتے ہیں مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ یہ کنگھے کی بجائے فرش دھونے کا برش استعمال کرتے ہیں تیل کی بجائے کول تار لگاتے ہیں کہ اس سے کم ثقالت کا تیل ان پر کوئی اثر

ہی نہیں کر سکتا۔

ایک دفعہ یہ حجام سے بال کٹوا رہے تھے۔ شومئی قسمت سے حجام ان کے بالوں میں قینچی رکھ کے بھول گیا اس کے بعد اس بیچارے نے ہزار بار ادھر اُدھر ٹٹولا مگر قینچی کہیں نہ ملی میز پہ دیکھا کرسی کے نیچے دیکھا۔ قینچی کہیں نہ ملی پھر اسے شبہ سا ہوا وہ انہیں اٹھا کے تھانے میں لے گیا وہاں ان حضرت کی جامہ تلاشی ہوئی مگر قینچی کہیں سے دستیاب نہ ہوئی گھر آ کر ان حضرت نے بڑے اطمینان سے قینچی اپنے بالوں سے نکال کر میز پہ رکھ دی۔ قینچی آج تک ان کے مینٹل پیس کی زینت ہے۔ برازیل کے جنگلوں کی طرح ان کے بالوں کے متعلق بھی آج تک یہ پتہ نہ چلا کہ ان میں کس طرح کے حشرات الارض پائے جاتے ہیں۔ بہت سے حجاموں نے تحقیق کرنے کی کوشش کی مگر آج تک کوئی حجام ان کی کھوپڑی تک نہ پہنچ سکا۔ دنیا کو پھر ایک نئے تن سنگھ کی ضرورت ہے تین بار شادی کر چکے ہیں چوتھی کی فکر میں ہیں چوتھی ان کی فکر میں ہے۔ مگر ہم ابھی تک کنوارے ہیں!

ایک اور صاحب ہیں بدقسمتی سے یہ بھی بمبئی میں رہتے ہیں بہت بڑے شاعر ہیں۔ ان کے بال گھنگھریالے تو نہیں۔ مگر بے حد سیاہ اور بے حد چمکیلے ہیں یہ اپنے بال ہمیشہ بڑھائے رکھتے ہیں اور اگر کبھی

اپنی بیوی کے اصرار پر حجام کے پاس جاتے ہیں تو بشرے سے ایسی اذیت کا اظہار کرتے ہیں جیسے بال نہیں کٹوا رہے ہیں گردے کا آپریشن کروا رہے ہیں مشاعرہ میں شعر پڑھیں گے اور اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں گے۔ دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا ہے۔ مصرعے ان کے ذہن میں نہیں۔ بالوں میں اٹکے ہوئے ہیں عورتوں میں بھی بہت مقبول ہیں گو مجھے آج تک یہ پتہ نہ چل سکا کہ ان کی مقبولیت کا راز کیا ہے؟ ان کے بال یا ان کے شعر گنجے ہو جائیں تو کچھ پتہ چلے۔

مرد تو اس مرض میں مبتلا تھے ہی۔ مگر اب عورتیں بھی اس سے مبرّا نہیں حالانکہ یہ زمانہ زیادہ بالوں کا نہیں کم بالوں کا ہے آج کل مغرب سے جو بھی فیشن نکلتا ہے اس میں زیادہ سے زیادہ بال کاٹ کر کم سے کم بال سر پر رہنے دیے جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ مغرب کی زیادہ ترقی کا راز بھی یہ ہے۔ اس لئے اقوام یورپ دنیا کی دیگر اقوام کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہیں۔ مگر جانے ہماری مشرقی عورتوں کو کب عقل آئے گی۔ آج کل جس عورت کو دیکھئے مور کے پنکھ کی طرح اپنا جوڑا پھیلائے ہوئے ہے جس عورت کو دیکھو کمر تک بال پھیلائے ہوئے ہے اس سے پہلے کمر تک پھیلے ہوئے بال زلف دراز کا تذکرہ صرف شاعری میں ملتا تھا۔ آج کل آپ اسے ہر سڑک

کے موڑ پر گلی کے نکڑ پر دیکھ سکتے ہیں۔ گو مجھے شبہ ہے کہ ان عورتوں کے یہ بال اصلی بھی ہیں؟ میرا خیال ہے کہ آج کل کی عورتوں کے جو بال آپ کمر تک بلکہ گھٹنوں تک اترے ہوئے دیکھتے ہیں اس میں کارخانہ قدرت کو اس قدر دخل نہیں جس قدر گھوڑے کے بالوں کو یا لدّاخی بکریوں کی اون کو۔ میرا اندازہ ہے کہ آج کل کی ماڈرن مشرقی عورت جتنے نقلی بال استعمال کرتی ہے انہیں اگر اس کے جوڑے اور چوٹی سے الگ کر دیا جائے تو سردیوں کے لئے ایک اچھا خاصہ سویٹر تیار ہو سکتا ہے۔ اور ہمارے پنج سالہ پلان میں ایک نئی صنعت کا آغاز ہو سکتا ہے۔

میرا تعلق چونکہ افادی ادب سے ہے اس لئے میں کسی ایسی شے کو نہیں گردانتا جس میں مجھے کوئی مقصد یا فائدہ نظر نہ آئے۔ عورتوں کو تو تزئین و آرائش کی ہر وقت ضرورت محسوس ہوتی ہے اس لئے وہ ٹھیک بھی ہیں۔ لیکن یہ مرد کاہے کو اتنے لمبے لمبے بال بڑھا لیتے ہیں؟ میری تو کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ بخلاف اس کے آپ گنجے ہونے کے فوائد مجھ سے پوچھئے۔ مجھ سے کیا پوچھئے۔ اجی صاحب کسی بھی گنجے سے پوچھئے۔ معلوم ہوگا ہم سب لوگ ایک ہی یونی ورسٹی سے پڑھ کر نکلے ہیں۔

گنجے سر میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر گنجا آدمی چلتا پھرتا بیرومیٹر ہوتا ہے موسمیات کے سرکاری محکمہ کے سائنس دان موسم کی غلط پیشین گوئی کر سکتے ہیں مگر گنجا آدمی ایسی غلطی کبھی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی گنجی چندیا موسم کے خفیف سے خفیف اور نازک سے نازک تغیر و تبدل کا پتہ دیتی ہے سردی ہو یا گرمی بہار ہو یا برسات۔ سورج کی پہلی کرن اور بارش کی پہلی بوند گنجے سر پر اپنا اثر دکھاتی ہے پھر سوچیئے کہ اگر آپ جوان ہیں تو بڈھوں میں نہیں بیٹھ سکتے، تھوڑی دیر کے بعد وہ آپ کو اس حقارت سے دیکھیں گے یا اس شفقت سے حقہ بھرنے کو کہیں گے کہ آپ خود بخود ان کی محفل چھوڑ کر چلے جائیں گے لیکن اگر آپ گنجے ہیں تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے سارے دانشوروں کی محفلوں کے دروازے آپ کے لئے کھلے ہوئے ہیں بس اتنا کافی ہے کہ آپ سنجیدہ رو بلکہ ترش رو اور سر ذرا نیچے کر کے اور جھک کے اس طرح بیٹھ جائیے کہ آپ کا گنجا سر ہر ایک کو نظر آتا رہے اس کے بعد آپ ان کے برابر بلکہ ان سے بڑھ چڑھ کر ہانک سکتے ہیں اور کہیں چند گھنٹوں کے بعد آپ نے ساری بحث سُن کر جو صرف ایک فقرہ کہہ دیا" اور مگر وہ جو افلاطون نے اپنی کتاب بقراطیت میں سقراط کے بارے میں توجیہات کی ہیں اُن سے آپ کے واقعات و اتہامات کا کچھ پتہ نہیں چلتا" تو سارے بڈھے ایک دم غش کھا کر گر جائیں

گے اور ممکن ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد خود آپ کے لیئے حقہ بھر کے لئے آئیں اور یہ سب کچھ گنجے پن کے طفیل ہو گا۔

اور یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ ناشتہ کے وقت گنجے سر سے انڈے توڑنے کا کام لیا جا سکتا ہے بلکہ مصنف کا تجربہ ہے کہ اگر بیضہ نیم برشت ہو تو یہی چند یا ایک عمدہ پلیٹ کا کام دے سکتی ہے۔ اور میں نے توبڑے بڑے جغادری قسم کے گنجوں کو اپنے سر سے بادام اور اخروٹ تک توڑتے دیکھا ہے۔ پہلوان اسی لئے سر گھٹاتے ہیں کہ مخالف پہلوان کا سر توڑنے میں آسانی ہو کوئی بالوں والا آج تک عظیم پہلوان نہ ہو سکا۔ نہ صرف ذہنی طور پر بلکہ جسمانی طور پر بھی عظمت کا راز گنجے پن میں ہے۔

کہاں تک گنواؤں، دراصل گنجے پن کے فائدے ذاتی تجربے سے حاصل ہوتے ہیں گنجے ہو جائیے پھر دیکھئے اس کے نت نئے فوائد اپنے تمام اسرار ورموز کو کھولے ہوئے آپ کے ذہن پر آشکار ہو جائیں گے، سمجھانے کے لئے ایک مثال دیتا ہوں۔ مثال بھی ہے۔ کہانی بھی ہے۔ جائے عبرت بھی ہے

ایک دفعہ کا ذکر ہے میں اور خواجہ احمدؐ عباس ریل میں سفر کر رہے تھے کسی ادبی کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ رات کا سفر تھا اس لئے بڑے مزے سے ترقی پسند ادب اور فن افسانہ نگاری پر بحث ہوتی رہی میں بولتا رہا اور وہ ٹائپ کرتے رہے (عباس نے اپنے اکثر افسانے

اس طرح لکھے ہیں) اس طرح باتوں ہی باتوں میں صبح ہو گئی جہاں جانا تھا وہ شہر اب قریب آرہا ہے اس لئے ہم لوگوں نے سوچا کہ جلدی سے شیو بنا کر نہا کر کپڑے بدل لئے جائیں چنانچہ جلدی سے میں نے شیو کا سامان نکالا اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ آئینہ غائب ہے۔ میں نے گھبرا کر عباس سے آئینہ مانگا تو اُس نے جب اپنا بیگ ٹٹولا تو وہاں بھی آئینہ ندارد۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی آئینہ نہ لایا تھا۔ (گنجے ہونے کے بعد آئینہ سے نفرت ہو جاتی ہے یہ ایک نفسیاتی امر ہے جس کی تشریح یہاں مناسب نہیں ہے)

اب شیو کیسے بنائیں میں بھاگ کر باتھ روم میں گیا اتفاق سے وہاں آئینہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ اب کیا کریں؟

یکایک بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میرے ذہن میں ایک خیال آیا میں نے عباس سے کہا "ذرا قریب تو آئیو" وہ بے چارہ اُٹھ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے سر کو گھما کے جھکا کے اس کی چندیا کو بالکل اپنے چہرے کے سامنے کر لیا۔ اور بڑے آرام سے شیو بنالی اس کے بعد اس نے بھی میرے سر سے یہی سلوک کیا۔ جب ہمیں احساس پیدا ہوا ہمارا سر گنج معانی کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔

تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اور اس طرح کے دیگر فوائد یہاں بیان نہیں کئے جا سکتے موقع پڑنے پر خود بخود الہام کی طرح نازل ہوتے رہتے ہیں

مگر صاحب فائدے لاکھ ہوں۔ ایک نقصان ہی ایسا ہے کہ سب پر حاوی ہے۔ اور وہ یہ کہ مدعی لاکھ چاہے اس کی شادی نہیں ہو سکتی جب تک وہ گنجا ہے۔ اور گنج ایسی شے ہے جو آکر کبھی نہیں جاتی۔ دنیا میں باقی تمام چیزیں ایسی ہیں جو امتداد زمانہ کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں مگر گنج ایسا کہ ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے۔ پہلے سال چاندی کی اشرفی بنتا ہے۔ دوسرے سال بڑھ کر ہتھکڑی کے حلقہ جتنا ہو گیا۔ تیسرے سال نخشب کا چاند ہو گیا جو نہ کبھی شق ہوتا ہے نہ ہلال کی صورت میں تبدیل ہوتا ہے کوئی بھی دوا لگائیے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کسی طرح بھی دیکھئے شادی اور گنج کا گہرا تعلق ہے۔ کچھ لوگوں کی اس لئے شادی نہیں ہوتی کیونکہ وہ گنجے ہوتے ہیں کچھ لوگ اس لئے گنجے ہو جاتے ہیں کیونکہ شادی ہو جاتی ہے تعلق ہمیشہ باقی رہتا ہے۔

ہاں تو ذکر میرے کنوارے پن کا تھا۔

ہاں تو صاحب جب عمر چہل سال ہو دا اور میری شادی نہ ہوئی تو میں بہت پریشان ہوا اور گھبرا کے ایک عامل کے پاس گیا۔

عامل بہت سیانا تھا۔ اُس نے بڑے غور سے میری رام کہانی سُنی پھر اس نے بڑی شفقت سے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا "عزیز من مجھے افسوس ہے کہ

میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ شادی کے معاملہ میں میں کسی گنجے آدمی کو تعویذ نہیں دیتا یہ عمل وطل تمہارے سلسلہ میں سب بیکار ہے کیونکہ گنجے آدمی کے معاملے میں، عورت کسی کی نہیں سنتی۔ اسم اعظم کا جادو بھی نہیں چلتا۔

میں نے گڑگڑا کر کہا "اے پیر نیک صورت مشتبہ سیرت اب بتائیں کیا کروں کیسے شادی کروں؟"

"بیٹا تو سیدھا ٹائمس آف انڈیا کے دفتر چلا جا اور شادیوں کے کالم میں ایک عرضی داغ دے۔ ضرورت ہے۔ ایک عورت کی جوان ہو یا بڑھیا، کالی ہو یا گوری، متمول ہو یا مفلس، خاندان ملک، جہیز عمر تک کی کوئی قید نہ لگائیو اور پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے انتظار کیجو۔ اللہ دے گا اللہ بڑا کارساز ہے۔ بس ایک دنیا دغاباز ہے۔"

یہ کہہ کر عامل نے آنکھیں بند کرلیں اور مراقبے میں کھو گیا۔ میں اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کے رخصت ہونے والا تھا کہ آواز آئی

"پانچ روپے رکھتا جا"

عامل کی ہتھیلی کھلی تھی۔

میری عرضی کے جواب میں کوئی دو سو درخواستیں آئیں۔ خوشی کے مارے میری باچھیں اور بتیسی دونوں کھل گئیں۔ کھلا پڑتا تھا۔ اور اصل میری غلطی تھی آج کل کی شادیاں نہ عشق سے سرانجام پاتی ہیں نہ ماں باپ کی مرضی

سے۔ آج کل دونوں طرف اشتہار دیئے جاتے ہیں دونوں طرف سے لڑکی لڑکے کے ناک نقشے۔ ذات۔ گوت۔ خاندان (اگر کوئی ہو تو) برادری سرکاری ملازمت۔ بنک بیلنس، سب کچھ ایک پنج سالہ پلان کی طرح پہلے پاس کرالیا جاتا ہے اور اب سب باتیں ایسی صاف صاف کاروباری انداز میں طے کرلی جاتی ہیں، کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ شادی نہیں کر رہے۔ ریفریجریٹر خرید رہے ہیں۔

اس کے بعد جب دونوں فریق کی تسلی ہو جاتی ہے، تو شادی کی تاریخ مقرر کردی جاتی ہے اس کے بعد وہی تمام رسمیں ادا کردی جاتی ہیں برات سہرہ بندی۔ مولوی کی نکاح خوانی پنڈت کی لن ترانی وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد بیوی کو میاں اور میاں کو بیوی مل جاتی ہے چنانچہ میرا مطلب ہے۔ دیمآید — بہرحال بزرگوں سے پوچھنا پڑے گا۔ اس موقع کے لئے کونسی کہاوت موزوں رہے گی۔

میں سمجھتا ہوں اگر اشتہاری شادیوں کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو کچھ عرصہ کے بعد یہ بیچ کی رسومات۔ برات۔ بیاہ سہرا وغیرہ بھی فروعات قرار دے کے ختم کردی جائیں گی اور اس کے بعد بڑی آسانی ہو جائے گی اِدھر سے آپ نے اخبار میں اشتہار دیا اور سب کچھ طے کر کے پوسٹل آرڈر بھیج دیا۔ اُدھر ایک بیوی لکڑی کے بکسے میں پیک ہو کر

آپ کے گھر پہنچ گئی۔ چھٹی۔

میں سمجھتا ہوں اگر ہمارے وقتوں میں ایسا ہو جاتا تو کم از کم میری زندگی میں وہ المیہ نہ آتا جس کا میں اب ذکر کروں گا۔

ہوا یہ کہ میں نے دو سو درخواستوں میں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو تو الگ کر دیا کہ یہ دونوں قدامت پسند قومیں ہیں۔ ان سے کسی گنجے کی نہیں نبھ سکتی۔ اب میں نے سوچا اور اپنی دانست میں ٹھیک سوچا کہ مجھے شریک زندگی کے لئے ایک ایسے فرد کی ضرورت ہے جو ذرا آزاد خیال ہو جو خود بال کٹاتی ہو ایسی لڑکی ضرور پہلے میرے گنجے پن پر ناک بھوں چڑھائے گی۔ مگر بعد میں آہستہ آہستہ مانوس ہو جائے گی۔ جو عورت بالوں کی مفارقت ایک حد تک گوارا کر لیتی ہے وہ ایک نہ ایک دن بالوں کی مکمل مفارقت کی بھی عادی ہو جاتی ہے۔

یہی سمجھ کر میں نے مس بارودوالا کا انتخاب کیا۔ بال کٹے ہوئے چہرہ متبسم۔ رنگ کھلتا ہوا دختر پارس گھر کی واحد چشم و چراغ، دولا کھ کی جائداد اس کے ماں باپ کے مرنے پر حصے آئے گی ان تمام باتوں نے مل ملا کر قرعۂ فال مس بارودوالا کے نام ڈال دیا۔ لڑکی بھی آئے اور دولت بھی آئے۔ یعنی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاھی میں (معلوم نہیں گنجے سر کا کڑاھی میں کیا حال ہوتا ہوگا)

شادی بڑے آرام سے سول میرج ایکٹ کے تحت سرانجام پاگئی۔ وہ تو ٹھیک ہوا کیونکہ سُنا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی شادیوں پر بڑا غل غپاڑہ ہوتا ہے۔ دولھا کی پگڑی کھل جاتی ہے ٹوپی اتاری جاتی ہے جانے عین موقع پر کیا ہو جائے وہ تو جانیے بڑی خیریت ہوئی۔ پھر بھی میں نے نالی وڈ سے احتیاطاً ایک وِگ منگا کر پہن لی تھی کم از کم دو چار دن تو بھرم نہیں کھلے گا۔ بڑی عمدہ وِگ تھی۔ پیچھے کی طرف گھومے ہوئے سیاہ بال ذرا ذرا سے گھنگھریالے عجب بہار دیتے تھے۔ پہن کر ایسا معلوم دیتا تھا۔ جیسے میں کبھی گنجا نہ تھا۔

شبِ عروسی میں جب راز و نیاز کی باتیں ہونے لگیں۔ تو میری بیوی یعنی سالیقہ مس بارود والا میرے گلے سے لگ کر اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ڈارلنگ تم کتنے خوبصورت ہو۔ تمہارے بال آہ! پیچھے کو گھومے ہوئے پیارے پیارے بال کتنے عمدہ معلوم ہوتے ہیں۔ میں خاموش رہا۔ کہتا بھی کیا۔

جب اچھی طرح تعریف کر چکی تو بولی "تم سے ایک راز کی بات کہتی ہوں"

"کہو" میں بولا

"میں بالکل دولت مند نہیں ہوں۔ مسٹر بارود والا میرے باپ نہیں ہیں۔ چچا ہیں۔ وہ دو لاکھ کے خواب نہ دیکھو۔ وہ نہ میرے نہ تمہارے

حصّے میں آئیں گے وہ تو میرے چچا کے لڑکوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔" مس یارووڈ الا ایک سانس میں سب کچھ کہہ گئیں۔

مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے کسی نے مجھے ساتویں منزل سے اُٹھا کر نیچے پٹخ دیا ہو۔ اچھا تو مجھ سے چالاکی برتی گئی اور یہ عورت اس وقت کس شیریں بیانی سے اس دھوکے پر سے پردہ اُٹھا رہی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ پگلی!

وہ پھر بولی "میں تمہیں شادی سے پہلے بتا دیتی۔ مگر میں تو تمہارا فوٹو دیکھ کر ریجھ گئی تھی۔ ہائے یہ خوبصورت اور ریشمیں بال یہ کہاں سے مجھے ملتے؟" میرا جی چاہا، کمبخت کا گلا گھونٹ دوں۔ پھر سوچا کم بخت کو کسی نہ کسی طرح سے اس کا مزا چکھانا چاہیئے۔

میں نے بڑے پیار سے اُس کی بلائیں لے کے کہا۔ "ڈارلنگ ایک پیار کی بات میں بھی تم سے کہتا ہوں۔" کہو وہ بڑے پیار سے میرے بالوں کو چومتی ہوئی بولی کہو میری جان۔"

میں نے اپنے آپ کو اس سے چھڑا کے اپنے سر سے وگ اتارتے ہوئے کہا ڈارلنگ دیکھ لو ایک دھوکا میں نے بھی تم سے کیا ہے میں بالکل گنجا ہوں۔

اب میں بہت خوش تھا۔

کیونکہ میرے گنجے سر کو دیکھ کر وہ بالکل سٹ پٹا گئی - کچھ دیر تک بالکل سناٹے میں رہی - ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا دماغ کام نہیں کر رہا ہے - اس کے بعد وہ یکایک زور زور سے ہنسنے لگی اور زور سے قہقہہ مار کر دوہری ہو گئی -

میں بڑا چکرایا یہ کیا ماجرا ہے -

میں نے شرمندہ ہو کے کہا اس میں ہنسنے کی بات ہے - بس ایک ذرا گنجا ہوں - ورنہ دنیا میں ہزاروں ایسے آدمی ہیں - جو"

وہ میری بات کاٹ کر بولی نہیں یہ بات نہیں ہے مگر ڈارلنگ - ہاہاہا ارے میں ہنستے ہنستے مر جاؤں گی -

اس کے بعد وہ پھر اپنا فقرہ پورا کئے بغیر زور زور سے ہنسنے لگی -

اب مجھے غصہ آ گیا میں نے اُسے دونوں شانوں سے پکڑ کر زور زور سے جھنجھوڑا کیا بات ہے کیا بات ہے ؟ جو مجھ پر اس طرح ہنس رہی ہو -

میرے زور زور سے جھنجھوڑنے سے اس کے سر سے کپڑا اُتر گیا اور میں نے حیرت سے چیخ مار کر دیکھا - مس باروووالا بھی بالکل گنجی تھی -

سائجھے کا مُردہ

ساڑھے چار بجے کے قریب جب بھارگو کی بیوی اس کے کمرے میں چائے کا پیالہ لے کر گئی تو اس نے بھارگو کو اپنے پلنگ پر مردہ پایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوپہر کا کھانا کھا کے نیلولے کے دوران کسی وقت مر گیا تھا جبکہ بھگوتی اپنے کمرے میں سلائی کی مشین پر اپنا بلاوز سینے میں مصروف تھی۔ بھارگو ایک عرصے سے دل کی بیماری میں متبلا تھا اور ڈاکٹر اس کی حالت اچھی نہیں بتاتے تھے

پھر بھی اس نے کئی برس گھسیٹ گھسیٹ کر گزار دیئے تھے اور اس کی بیوی بھگوتی کو مطلق یقین نہ تھا کہ وہ آج اچانک یوں سوتے سوتے بھگت جائے گا۔

سب سے پہلے بھگوتی کے دل میں خیال آیا کہ وہ ایک زور کی چیخ مارے اور اپنے پیٹنے رونے سے سارے محلے میں وحشت پھیلا دے، پھر یکایک اُسے اُس تجوری کا خیال آیا جس کی چابیاں بھارگو ہر وقت اپنی جیب میں رکھتا تھا۔ اور کبھی اپنی بیوی کے حوالے نہ کرتا تھا۔ بھارگو کے چار بیٹے تھے۔ دو انگلینڈ میں دو افریقہ میں بھارگو نے اپنی جمع شدہ پونجی میں سے اپنے چاروں بیٹوں کو اُن کے حصّہ کے ڈھائی ڈھائی لاکھ دے دیئے تھے اور باقی رقم لے کر بمبئی چلا آیا تھا۔ یہاں باندرے کی ایک نئی مضافاتی کالونی میں اوشا بلڈنگ میں تیرھویں سڑک پر اُس نے پچیس ہزار کی مالیت کا ایک فلیٹ خرید لیا تھا۔ اور اس میں اپنی بیوی بھگوتی کے ہمراہ رہتا تھا اس کے بیٹوں نے اپنے باپ کے اس اقدام کو پسند نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا باپ اپنی بقیہ پونجی بھی اپنے بیٹوں میں بانٹ دے اور خود باری باری ہر ایک بیٹے کے پاس رہا کرے۔ مگر یہ بات نہ بھارگو کو پسند آئی نہ بھگوتی کو۔ اس لئے

بیٹے بھارگو سے بدظن ہو گئے اور اپنے حصّے کے ڈھائی لاکھ لے کر انہوں نے صبر کرلیا اور ماں باپ کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔

چند لمحوں کی خاموش کش مکش کے بعد بھگوتی نے چیخ مارنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ سب سے پہلے اُس نے بھارگو کی جیب سے چابی نکالتے وقت بھگوتی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کیونکہ بھارگو بھگوتی کی طرح انتہائی حسین اور محتاط آدمی تھا اور روپے پیسے کے معاملے میں کسی پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ ایک لمحے کے لئے بھگوتی کے دل میں خیال گذرا کہ چابی نکالتے وقت یکایک بھارگو کے ہاتھ حرکت میں آجائے گا اور وہ بھگوتی کی اس جرأت پر زور کا ایک چانٹا بھگوتی کے رخسار پر رسید کرے گا۔ لیکن جب جیب سے چابی نکالتے وقت بھارگو کے ہاتھ بے حس و حرکت رہے اور جب اس چابی سے تجوری کھول کر بھگوتی نے نوٹوں کی گڈیاں گنیں اور اس وقت بھی بھارگو اپنے پلنگ سے اُٹھ کر تجوری کی طرف نہ آسکا تو بھگوتی کو کامل یقین ہو گیا کہ اس کا شوہر مر چکا ہے۔ اس نے تجوری بند کر کے چابی کو کس کر اپنے کمربند سے باندھ لیا۔ اور عنقریب وہ ایک زور کی چیخ مارنے کو تھی کہ یکایک اُس کی چیخ پھر ملتوی ہو گئی۔ کیونکہ اب بھگوتی کا دھیان اپنے مردہ شوہر کے ہاتھ کی طرف گیا جہاں دو بیش قیمت انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں ایک انگوٹھی نیلم کی تھی۔ دوسری ہیرے کی۔ بھگوتی نے سوچا تھوڑی دیر کے

بعد جب سب اکٹھے ہو جائیں گے۔ اس وقت تو میں چیخ پیٹ میں مصروف رہوں گی اس ہنگامے میں میرے لئے مردہ شوہر کی انگوٹھیوں پہ نظر رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔

چنانچہ بھگوتی نے جلدی جلدی سے اپنے شوہر کی انگلیوں سے دونوں انگوٹھیوں کو اتار کر تجوری میں رکھ دیا۔

پھر اس نے اپنے بال کھول ڈالے۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور ایک لمبی خوفناک چیخ ماری اور زور زور سے دھتڑ مار مار کر اپنا سینہ کوٹنے لگی اور چلا چلا کر بین کرنے لگی۔ اس وقت آس پاس کے فلیٹوں کے دروازے کھلنے لگے اور عورتیں اور مرد بھاگے بھاگے بھارگو کے فلیٹ کے اندر آنے لگے اور جب بھگوتی نے دیکھا کہ آٹھ دس مرد عورتوں کا جمگھٹا ہو گیا ہے۔ تو وہ سب کے سامنے روتی پیٹتی اپنے فلیٹ کی بالکونی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے کے لئے بھاگی مگر لوگوں نے اسے گھیر کر روک لیا۔

بمبئی میں شادی یا موت کا ہنگامہ چند گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے چند منٹ تک لوگوں کے حواس پر سراسیمگی چھائی رہی کچھ عرصہ کے لئے لوگ جوق در جوق فلیٹ کے اندر آ کر اظہارِ افسوس کرتے رہے اور بھگوتی عمدہ موزیک کے فرش پہ نیم دراز حالت میں تڑپتی ہوئی بین کرتی

رہی۔ لوگوں نے بھارگو کو فرش پر لٹا دیا۔ اور اس کے جسم پہ ایک چادر ڈال دی اور زیر لب افسوس کے کلمات بُدبُداتے ہوئے چلے گئے۔ گمان کیا یقین تھا کہ چند گھنٹوں کے بعد بھگوتی کے رشتہ دار یا بھارگو کے رشتہ دار یا دوست آئیں گے اور بھارگو کی لاش کو ٹھکانے لگا دیں گے۔ اس یقین کے ساتھ سب لوگ واپس اپنے اپنے فلیٹوں میں چلے گئے اور کرتے بھی کیا؟ فلیٹوں کی زندگی ہی ایسی ہوتی ہے۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں جانتا، پھر یہ تو ایک نئی مضافاتی کالونی تھی۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں جانتا تھا، اس لئے انسانی ہمدردی کی اُوپری سطح کو کھرچنے کے علاوہ اور کیا ہی کیا جا سکتا تھا؟

البتہ چند لوگوں کو ضرور پریشانی تھی۔ ایک تو مجھے۔ کیونکہ جہاں میرا کھانے کا کمرہ تھا اُس کے بالکل اُوپر کے کمرے میں بھارگو کی لاش رکھی تھی اور اپنے کمرے میں کھانا کھاتے ہوئے مجھے بجا طور پر یہ احساس ہو رہا تھا گویا میں ایک لاش کو اپنے کندھے پر رکھے ہوئے۔ ورنہ بمبئی کے فلیٹوں کی زندگی میں یہ سب کچھ ممکن تھا۔ کیوں کہ جہاں میرے سونے کا کمرہ ہے اس کے بالکل اوپر نچلی والے فلیٹ کا باتھ روم ہے اکثر اوقات اپنے پلنگ پر لیٹے لیٹے اچانک فلش کی آواز سے میں چونک کر بیدار ہو جاتا ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی صاحب میرے سر پر بیٹھے ہوئے رفع حاجت میں مصروف ہیں، حالانکہ مجھے شکایت نہ کرنی چاہیئے کیونکہ

میرا باتھ روم بھی کسی کے بیڈ روم کے بالکل اُوپر ہوگا اس کے لئے مجھے اس قسم کی باتوں کا عادی ہو جانا چاہیئے اب ایک لاش میرے کھانے کے کمرے کے بالکل اُوپر پڑی رہے تو مجھے کیا؟ بھارگو کے رشتہ دار آئیں گے اور اُسے ٹھکانے لگا دیں گے۔ جب تک میں ریفریجیٹر کھول کر برف میں لگے ہوئے دو آم الفانزو کے کیوں نہ کھالوں۔ مجھے زور کی بھوک لگی ہے۔ اور میں نے اکثر دیکھا ہے کہ کسی کے مرنے کی خبر سنتے ہی مجھے زور کی بھوک لگ آتی تھی، شاید یہ زندہ رہنے کی خواہش ہے جو زور سے ابھر کر بھوک کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ کیا معلوم؟ میں الفانزو کھاتے کھاتے اپنے مزاج کی اس افتاد پر غور کرنے لگا۔

میرے علاوہ مگن بھائی کیمسٹ کو بھی پریشانی تھی کیونکہ اس کے فلیٹ کا دروازہ بھارگو کے فلیٹ کے بالکل سامنے کھلتا تھا اور آتے جاتے دروازہ کھلتے اس کی بیوی بچے اپنے فلیٹ سے بھارگو کے ڈرائنگ روم کے فرش پر پڑی ہوئی لاش کو دیکھ سکتے تھے۔ محض چند قدم کے فاصلے پر! لاش پر سے چادر سرک گئی تھی۔ اور بھارگو کے کھچڑی بال اور اس کے زرد کان کی لو نظر آرہی تھی اور اسے دیکھ کر مگن بھائی کے بچوں کے جسم میں ایک عجیب سنسنی سی دوڑتی تھی اور مگن بھائی کی بیوی شاردا کو ابکائیاں شروع ہوگئی تھیں۔ لاش ایک طرح سے موت کی مسلسل یاددہانی ہوتی

ہے اور اس کی یاد دہانی کو کون پسند کر سکتا ہے۔ جتنی جلدی اس سے
چھٹکارا مل جائے اچھا ہے۔

شام کے سات بجے کے قریب بھگوتی کا ایک ماموں آیا۔ بھگوتی کے ماموں
کی شکل پہلے انک کے امرود سے ملتی جلتی تھی اور وہ بھی دل کے عارضے میں مبتلا
تھا۔ اس لئے وہ بھی لاش کے قریب زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرا۔ اظہار افسوس کرنے
کے بعد اس نے بھگوتی سے اس کے بیٹوں کا ایڈریس لیا۔ انھیں ٹیلیگرام بھجوانے
کا وعدہ کیا اور بھگوتی کے پاس اپنا ایک آدمی چھوڑ کر چلا گیا۔ ہم یہ سمجھے کہ
تجہیز و تکفین کا بندوبست کرنے گیا ہے۔ مگر جب رات کے دس بج گئے
اور بھگوتی کا ماموں نہیں آیا۔ تو ہم نے اس کے آدمی سے پوچھا جو لاش کے
قریب بیٹھا تھا۔ وہ آدمی افسوس سے سر ہلا کر بولا "ہم کو کچھ معلوم نہیں ہے
مردے کا کیا ہوگا؟ ہم کو سیٹھ ادھر بیٹھا کے بول گیا ہے۔ ادھر تم اکھارات
بیٹھے گا۔ مردے کا جو کوئی سگے والا آئے گا۔ اس کو مردے کا منھ دکھائے گا۔
پھر چادر ڈال دے گا۔ ہم ساری رات مردے کے پاس اس کام کے لئے
بیٹھے گا۔ ہم کو اس کام کے واسطے دس روپیہ سیٹھ دے گا۔ صبح چھ بجے
ہم چلا جائے گا۔"

تو کیا آج رات بھر لاش اسی پلنگ میں پڑی رہے گی؟" مگن بھائی
نے اس سے پوچھا۔

ہم کو کیا مالم ؟ وہ آدمی خفا ہو کر بولا۔ ہم کیا مردے کا سگے والا ہے۔
ہم دس روپیہ رات کا لیتا ہے جو آدمی آتا ہے اس کو مردے کا منھ دکھاتا
ہے۔تم کو دیکھتا ہو تو دیکھو، جاستی بات مت کرو۔"

صبح چھ بجے وہ چلا گیا ہم نے بہت روکا۔ مگر وہ نہیں رکا۔ ہم نے
اُس سے بھگوتی کے ماموں کا پتہ مانگا اُس نے نہیں دیا۔ بولا ہم کو کیا مالوم ؟
سیٹھ نے دوکان پر ٹیلیفون کر کے ہم کو منگایا تھا۔ اب ہم جاتا ہے!"

"لیکن ؟" میں نے پوچھا

"دوسرے مردے کے پاس!"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

رات تو کسی طرح گذر گئی، لیکن اب یہ دن کسی طرح نہ گذر سکتا تھا گرمیوں کے
دن تھے، اگر مردے کو جلدی ٹھکانے نہ لگایا گیا تو لاش سڑنے لگے گی اس لئے
جب دوسرے دن صبح کے دس بج گئے اور بھگوتی یا بھارگو کا کوئی رشتہ دار
لاش کو اُٹھانے کے لئے نہ آیا تو ہم سب لوگ پریشان ہونے لگے اور بلڈنگ
کے لوگ بھارگو کے فلیٹ کے باہر اکٹھا ہونے لگے!

بھگوتی نے بتایا اس کا ماموں رات سے اب تک نہیں آیا تھا۔ ہم نے بھگوتی
سے ٹیلیفون نمبر لے کر اسے ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت ٹھیک
نہیں ہے وہ نہیں آسکتا۔ دو لڑکے انگلینڈ میں تھے۔ وہ نہیں آسکتے تھے۔

دوا فریقہ میں تھے وہ نہیں آسکتے تھے احمد آباد میں جو رشتہ دار ہے اُس کے آنے کی کوئی اُمید نہیں ہے کیونکہ بھگوتی کے بیان کے مطابق، کچھ روپے پیسے کا جھگڑا تھا۔

دوسرے دن صبح دس بجے یکایک بلڈنگ والوں پر انکشاف ہوا کہ اس میت کو انھیں ہی سنبھالنا پڑے گا۔ اس پر سب لوگ پہلے پریشان سے ہوئے پھر ایک دم سب کی بشاشت عود کر آئی اور سب لوگ اپنا کام کاج چھوڑ کر میت کو سنبھالنے میں مصروف ہو گئے۔ کیونکہ بیچاری بھگوتی تو عورت ذات تھی اسے نہ تو کچھ معلوم تھا۔ رات بھر روتے روتے اس کی آنکھیں سوجھ گئیں تھیں اور سرخ انگارہ سی دھکتی تھیں۔

چنانچہ اس کام کو سرانجام دینے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا سکرٹری مجھے منتخب کیا گیا اور خزانچی اشرف الدین بوھرہ کو جو ہماری بلڈنگ کا سب سے امیر آدمی تھا کئی آدمی ہماری امداد کے لئے اس کمیٹی میں شامل کئے گئے۔ پنڈت دیا رام جیسے ایک تجربہ کار برہمن تھے۔ اب تک کئی ہون کا بھگوان کر چکے تھے۔ کہانے بھولا ناتھ کہ ان کے گھر میں ایک ٹیلیفون بھی تھا۔ گور سنگھ کرت کو لاش کو جلد سے جلد ٹھکانے لگا۔ ان کا فلیٹ بھارگو کے فلیٹ کے سامنے تھا۔ مجھے اس لئے چنا گیا مجھے سیکرٹری اس لئے چنا گیا کیونکہ میرے پاس ایک ایسی شفقت بھری مسکراہٹ ہے جو ہمیشہ موجود رہتی ہے جو ہر کامیاب سیکرٹری کے لئے

کہ وہ خندہ پیشانی سے پیش آسکے۔ لازمی ہے۔

مگر مردے کو ٹھکانے لگانے کے معاملے میں میں بالکل کورا تھا۔ اس لئے پنڈت دیارام براشر نے مجھے بتایا کہ سب سے پہلے کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیئے۔ اور اس سے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ لینا چاہیئے۔ ورنہ مردہ جلایا نہیں جاسکتا۔

"مرحوم کس ڈاکٹر کا علاج کرتے تھے؟" میں نے بھگوتی سے بار بار پوچھا مگر وہ رونے دھونے میں اس قدر مصروف تھی کہ ٹھیک سے کچھ بتا نہ سکی۔ بس اتنا پتہ چلا کہ مرحوم نے مرنے سے پہلے چند روز قبل اپنا علاج کردیا تھا اور چند روز قبل وہ ڈاکٹر شاپانی کے زیر علاج تھے!

میں شرف الدین بوہرے کی گاڑی میں بیٹھ کر ڈاکٹر شاپانی کے مطب میں گیا تو بھارگو کا نام سنتے ہی وہ بھڑک اُٹھا"

"میں ہرگز اس کے لئے میڈیکل سرٹیفکیٹ نہیں دوں گا! میرے تین ماہ کا بل اس نے ادا نہیں کیا۔ ڈھائی سو روپے کا"

"آپ کے پیسے ادا ہو جائیں گے!" شرف الدین بوہرہ کامل اطمینان سے بولا۔ مرحوم ایک امیر آدمی تھا!"

"ہم ابھی مرحوم کی بیوی یعنی بیوہ سے آپ کے پیسے لا کر دیتے ہیں" میں نے کہا۔

"پہلے میرا پچھلا تین ماہ کا بل کوئی ادا کرے، اس کے بعد مجھ سے سرٹیفکیٹ مانگنے آئے!"

ہم لوگ گاڑی میں واپس آئے میں نے اندر جا کے بھگوتی سے استفسار کیا تو بے چاری کراہتی ہوئی رونے لگی۔ ہائے میں غریب بیوہ مجھے ابھی سے لوگ لوٹنے لگے ہائے مجھے کچھ معلوم نہیں کسی ڈاکٹر کا بل مجھے نہیں دینا ہے۔ مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔ ہائے میرا سہاگ لٹ گیا۔ اور لوگ مجھ سے پیسے مانگتے ہیں۔"

ادھ گھنٹے تک وہ ایسے ہی ننگے فرش پر جھکی بین کرتی رہی مگر تجوری سے اس نے پیسے نکال کر نہیں دیا۔ چار بلڈنگ والوں نے چندہ کیا اور ڈاکٹر شاباتی نے بھاگو کی لاش معائنہ کرنے کے بعد کہا البتہ مرحوم کی موت دل کی حرکت بند ہو جانے سے ہوئی ہے میں اس امر کا سرٹیفکیٹ دے سکتا ہوں

میں بہت خوش ہوا۔ مارے خوشی کے منگو بھائی کی باچھیں بھی کھل گئیں مگر جگناتھ بھولا ناتھ کا منہ تک لٹک گیا۔

بولے "یہ سرٹیفکیٹ نہیں چلے گا!"

"کیوں نہیں چلے گا؟" پنڈت دیا رام پرانتر نے ذرا تلخ لہجے میں پوچھا۔

پنڈت دیا رام پرانتر جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا ٹھیٹ سناتنی تھے اور جگناتھ بھولا ناتھ پکے آریہ سماجی، دونوں میں تناتنی رہتی تھی مگر ڈھیمی ڈھیمی!

مہاشے بھولا ناتھ بولے "اِدھر اگر سرٹیفکیٹ میں ہارٹ فیلیور لکھ دیا تو پولیس مردہ جلانے نہیں دیتی۔ اُس مردے کا پوسٹ مارٹم ہوتا ہے!"

ہمارے سرگودھے میں تو نہیں ہوتا ہے" پنڈت دیا رام پراشر نے حیرت سے کہا۔

یہ سرگودھا نہیں، بمبئی، مہاشے بھولا ناتھ نے فخریہ لہجے میں یوں کہا جیسے کہہ رہے ہوں "ون اب!"

ٹھیک کہتا ہے، مہاشے جی ٹھیک ہی کہتا ہے۔ شرف الدین بوہر بولا ادھر بمبئی کا دل یہی ہے!"

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے جھوٹا سرٹیفکیٹ دینا ہوگا، ڈاکٹر شاہانی بولا۔

"جھوٹا کیوں؟ میں نے پوچھا" بھاگو مر چکا ہے۔ اس کی لاش تمہارے سامنے موجود ہے۔"

مگر مجھے مرض تو غلط لکھنا پڑے گا" ڈاکٹر شاہانی بولا" تاکہ لاش کا پوسٹ مارٹم نہ ہو سکے۔

"ہاں یہ تو ہے" ملک بھائی بولا

تو اس کے لئے الگ فیس ہو گی! ڈاکٹر شاہانی نے اعلان کیا پندرہ روپیہ!"

میں نے اندر جا کر بھگوتی سے پندرہ روپیے مانگے، مگر وہ منہ سے کچھ

نہیں بولی، سسک سسک کر اور کراہ کراہ کر روتی رہی۔ مگر اُس نے مجھے پندرہ روپے نہیں دیئے تو میں نے اپنی جیب سے نکال کے دیئے۔ تب ڈاکٹر شایانی نے سرٹیفکیٹ دیا۔ تو مہاشے بھولا ناتھ نے پوچھا "مُردے کو جلایا کہاں جائے گا؟"

"میں نے جواب دیا۔ شمشان گھاٹ میں!

"ہاں۔ ہاں۔ شمشان گھاٹ میں، مگر کس شمشان گھاٹ میں مہاشے بھولا ناتھ نے پوچھا ـــــ سب سے اچھا شمشان گھاٹ تو میرن ڈرائیور پر ہے۔ شہر کے تمام بڑے بڑے اور امیر آدمی وہیں پر جلاتے ہیں، بھگوتی کا کیا ارادہ ہے؟

میں نے جب بھگوتی سے پوچھا تو وہ زور زور سے رونے لگی،" ہائے جب سہاگ ہی لٹ گیا، تو اچھے بُرے کی کیا تمیز۔ ارے کہیں بھی جلا دو اور ہو سکے تو مجھے بھی اس کے ساتھ جلا دو!"

—— ⁂ ——

مہاشے بھولا ناتھ نے میرن ڈرائیور کے شمشان گھاٹ پر ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا کہ گھاٹ پر ہاؤس فل ہے۔

رات تک کے لئے لاشوں کی بکنگ ہو چکی ہے ایک جگہ بھی خالی نہیں ہے۔ مجبور ہو کر ہم لوگ سانتا کروز کے شمشان گھاٹ پر گئے۔

شرف الدین بوہرہ کی گاڑی میں بیٹھ کر معلوم ہوا سانتا کروز کا شمشان گھاٹ بھی فل ہے۔ کل صبح تک ایک سیٹ بھی نہیں مل سکتی!

"تم ہندوؤں کے یہاں بہت لفڑا ہے جلانے کا" شرف الدین بوہرہ نے بڑی بیزاری سے اعلان کیا۔ کمیٹی میں شرف الدین کے سوا باقی سب ہندو تھے اس لئے اُن سب کا خون کھول گیا۔ مگر سب چپ رہے، کیونکہ گاڑی شرف الدین کی تھی۔

سانتا کروز سے ہم لوگ واپس باندرہ کے شمشان گھاٹ کی طرف گئے جو ریلوے اسٹیشن کے یارڈ میں واقع ہے اس شمشان تک پہنچنے کے لئے بیچ میں ریلوے کے دو کراسنگ آتے ہیں۔ جن کے دروازے اکثر ریلوے والوں کی اپنی ضرورت کے مطابق کھلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ سانتا کروز سے باندرہ کے اسٹیشن یارڈ کے اندر پہنچتے پہنچتے ایک گھنٹہ اور بیت گیا۔ شمشان گھاٹ کا مہتمم بڑی مشکل سے مانا۔

آج بہت رش ہے" وہ سر ہلا کر۔

کسی طرح سے ہمارا مردہ لے لو۔ رات سے سڑ رہا ہے، میں نے اس کی منت سماجت کی چار لہاسیں (لاشیں) ابھی اور آنے والی ہیں۔ اور دو جل رہی ہیں۔

مہتمم میری طرف خشونت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

جگہ کدھر ہے، دیکھتے نہیں ہو؟"

پنڈت دیا رام پراشر اُسے ایک کونے میں لے گئے۔ چند منٹ تک اس سے کچھ کھسر پھسر کرتے رہے، آخر وہ رام ہو گیا، پنڈت دیا رام مہتم کے ساتھ ہمارے گروپ میں واپس آئے تو کامیابی سے ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا، بولے "ہو گیا کام!"

مہتم نے سر ہلا کے کہا۔ لے آؤ مگر دو گھنٹے کے بعد آنا۔ اس سے پہلے لاؤ گے تو اندر گھسنے نہیں دوں گا!"

صرف ایک کار!

میرے پاس کار نہیں ہے اور نہ ہونے کی اُمید ہے۔ ایسی حالت میں صرف ایک کام کر سکتا ہوں، اور وہ یہ ـــــ کہ کار کے موضوع پر ریسرچ کروں۔ کیونکہ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جس کے پاس جو نہیں ہوتا وہ اُسی پر زیادہ ریسرچ کرتا ہے آپ نے دیکھا ہو گا کہ جن لوگوں نے زندگی بھر ایک کہانی تک نہیں لکھی وہ لوگ کہانیوں پر سب سے طویل مضمون لکھتے ہیں اور کہانی لکھنے کے فن کے ماہر مانے جاتے ہیں۔ جن لوگوں کی زندگی میں کبھی کوئی خوبصورتی

نہیں آئی وہ فن جمالیات کے اُستاد سمجھے جاتے ہیں- اور جن لوگوں کی زندگی میں کبھی کوئی کام نہیں ملا- وہ وزیر بنا دیئے جاتے ہیں- تاکہ ہر موضوع پر لکچر دے سکیں —— زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا ایک نسخہ یہ بھی ہے کہ جو کام آپ کو جس حد تک نہ آتا ہو- اُسی حد تک - - - - - - - -

آپ اس میں اپنی دلچسپی اور مہارت دکھائیں —— مثال کے طور پر اگر آپ انجینئر ہیں- اور ایک اچھا پل بنا سکتے ہیں، بلکہ بنا بھی لیا تو کون سا تیر مار لیا؟ پل تو ہر انجینئر بنا لیتا ہے- لیکن آپ کو اچھا انجینئر اس وقت مانا جائے گا- جب آپ کسی ایسے دوسرے کام میں دلچسپی کا اظہار کریں- جو آپ کو بالکل نہ آتا ہو مثال کے طور پر اگر آپ انجینئر ہیں اور کسی نئی جگہ آپ کا ٹرانسفر ہوا ہے اور وہاں پر اگر آپ نے یہ مشہور کر دیا کہ آپ ستار بھی بجا لیتے ہیں تو فوراً آپ کی قابلیت کی دھاک بیٹھ جائے گی اور لوگ باگ فوراً کہنا شروع کر دیں گے- "نیا انجینئر بہت لائق معلوم ہوتا ہے- کیا ستار بجاتا ہے"- میرے پڑوس میں ایک نئے ڈاکٹر آئے ہیں- آتے ہی ڈیڑھ دو ماہ میں انہوں نے پورے محلے پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا ہے- میں ہر کسی سے پوچھتا ہوں "آخر بات کیا ہے- ڈاکٹر صاحب میں کیا خوبی ہے- تشخیص اچھی کرتے ہیں؟" نہیں" جواب ملتا ہے- تشخیص تو معمولی سی ہے جیسی کہ ڈاکٹروں کے ہاں اکثر ہوتی ہے"؟

"پھر کیا فیس کم لیتے ہیں؟"

"نہیں فیس بھی کم نہیں لیتے!" جواب ملتا ہے۔

"پھر کیا مریض کو جلدی اچھا کر دیتے ہیں؟"

جواب ملتا ہے "نہیں ایسا تو کوئی معجزہ نظر میں نہیں آیا اور پھر اچھا کرنا اور بُرا کرنا تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے ان میں؟" میں پوچھتا ہوں

جواب ملتا ہے "اجی کیا بتائیں، بڑے قابل ڈاکٹر ہیں۔ ایسے ایسے بڑھیا لطیفے سناتے ہیں کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔" انجینئر ستار بجائے، ڈاکٹر لطیفے سنائے۔ یہ ہے اس ملک میں قابلیت کی شناخت۔ اسی لئے آپ نے اکثر دیکھا ہوگا۔ کہ اس ملک میں جو کام جس کو آتا ہے وہ وہی کام نہیں کرتا ہے۔ اس ملک میں جسے واقعی فلم پروڈیوسر ہونا چاہیئے۔ وہ فوڈ کنٹرولر ہے وہ مشاعروں کی صدارت کرتا پھرتا ہے اور جسے مشاعروں کی صدارت کرنی چاہیئے۔ وہ کوئلے بیچتا ہے، اور جس کو کوئلے بیچنا چاہئیں۔ وہ مل کا مالک ہے۔

زندگی کا یہ عجیب دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ چونکہ میرے پاس کوئی کار نہیں ہے۔ یعنی میں بے کار ہوں۔ اس لئے کار کے موضوع پر تحقیق و تفتیش کرنے کے لئے میں ہی سب سے موزوں آدمی ہوں۔

مجھ سے پہلے بھی اس موضوع پر بہت سے لوگ تحقیق کر چکے ہیں مگر ان کا دائرہ عمل گذشتہ دو سو سال سے آگے نہیں بڑھتا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ پیچھے نہیں ہٹتا۔ کوئی کہتا ہے کہ کار گذشتہ ایک سو سال میں ایجاد کی گئی کوئی اس کی مدت ڈیڑھ سو سال بتاتا ہے۔ بہر حال دو سو سال سے پیچھے کوئی نہیں جاتا۔ اور سب کے سب اس بات پر متفق ہیں۔ کہ کار مغربی انجینیروں کی جدّتِ طبع کی مرہونِ منت ہے۔

مگر میری تحقیق یہ کہتی ہے کہ کار مغرب میں نہیں بلکہ مشرق میں سب سے پہلے ایجاد کی گئی اور کار دو سو سال پرانی نہیں ہے بلکہ کئی ہزار سال پرانی ہے۔ سنسکرت کے پرانے شاستروں اور گرنتھوں میں جا بجا اس کے حوالے ملتے ہیں اور اتنی تعداد میں ملتے ہیں کہ بسا اوقات حیرت ہوتی ہے کہ اُن تمام ہمارے لائق اور محبّ الوطن محققوں نے جو اس سے پہلے ریڈیو، بے تار برقی، ٹیلی ویژن، ٹیلیفون اور ہوائی جہاز کا وجود ہمارے شاستروں سے ثابت کر چکے ہیں کیسے ان کی نگاہ کار پر نہیں گئی۔ اور کس طرح وہ اتنی اہم ایجاد کو نظر انداز کر گئے اور دھوکے باز مغربی موجدوں کے دعووں کو شیرِ مادر کی طرح پی گئے؟ (ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ آج کل شیرِ مادر نہیں ہوتا صرف ڈبے کا دودھ ہوتا ہے)

بہر حال میں نے گذشتہ دس سال کی جانکاہ کاوش اور عرق ریزی سے

میری مراد اس امر سے ہے کہ گزشتہ دس سال میں صرف سنگتروں کا عرق پیتا رہا ہوں، جس کے بعد میں نے اپنی تحقیق مکمل کر لی ہے۔ اور اپنا مقالہ تیار کر لیا ہے جسے اب میں حاضرین "قارئین"، سامعین اور ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ سب حضرات مع اپنی خواتین کے میرے حق میں دُعا کریں گے اور اگر ہو سکا تو حکومت سے میرے لئے مہارتن کا خطاب عطا کرنے کی سفارش کریں گے۔ کہ جو ایسے ہی موقعوں پر دیا جاتا ہے۔

میرا دعویٰ ہے کہ پُرانے زمانے میں نہ صرف کاریں ہوتی تھیں۔ بلکہ اس کثرت سے ہوتی تھیں کہ ایک دو کے بجائے امیر آدمی سات سات کاریں رکھتے تھے۔ یہ لفظ "کار" بھی مغربی نہیں ہے۔ بلکہ ہندوستانی ہے اور قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے یعنی ویدک زمانے سے۔

شری کُنٹھا اچاریہ کی مشہور شبداولی میں کارسازی کی بہت سی اصطلاحات ملتی ہیں۔ یہ شبداولی جس قدر مشہور ہے۔ اسی قدر نایاب بھی ہے اب تک اس کے صرف دو نسخے دریافت ہوئے ہیں۔ ایک میونخ کے میوزیم میں تھا جسے ہٹلر کے حکم سے جلا دیا گیا۔ دوسرا میرے گھر میں تھا۔ جسے میری بیوی نے جلا دیا۔ بہرحال میں اپنی یادداشت پر زور دے کر چند لفظ رقم کرتا ہوں۔ جن میں "کار" کا لفظ موجود ہے اور جو ٹھیٹھ سنسکرت کے شبد ہیں اور جن کے معنی شری کُنٹھا اچاریہ کی شبداولی میں صرف کاروں سے متعلق تھے۔ یہ الفاظ آج بھی

ہمارے شبد کوش میں پائے جاتے ہیں مگر تغیر زمانہ سے اب ان کے معنی اصل سے بدل چکے ہیں۔ پھر بھی اگر آپ اپنے ذہن پر زور دے کر سوچیں گے تو آپ بدلے ہوئے معنی سے اس لفظ کے اصل معنی تک پہنچ سکیں گے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا۔ کہ پرانے زمانے میں تقریباً ہر فرشتے کا اپنا ایک دیوتا یا خدا ہوا کرتا تھا۔ جو دوسروں سے الگ ہوتا تھا اور جس کی پوجا خاص طور پر وہی فرقہ کیا کرتا تھا۔ اسی طرح پرانے زمانے میں کار رکھنے والوں کا اپنا بھگوان ہوا کرتا تھا۔ جسے لوگ کار کی مناسبت سے "اونکار" کہتے تھے۔

کنتھا آچاریہ کی شبداولی میں "اونکار" کے معنی دئے ہوئے ہیں ۔" کار والوں کا بھگوان"

آج کل بھی اونکار کا شبد بھگوان کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مگر اب وہ کار والوں کے بھگوان کے لئے استعمال نہیں ہوتا ہر طرح کے بھگوان کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

"آکار"..... یعنی وہ کار جو سامنے نہ ہو۔ لیکن جس کی پوجا دل ہی دل میں کی جاتی ہو۔ اُسے "آکار" کہتے ہیں یہی کار جب خرید لی جاتی ہے تو "ساکار" بن جاتی ہے آج کل "آکار" اور "ساکار" بھگوان کے جانب اور حاضر روپ کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ مگر پرانے زمانے میں شاید صرف کار والوں کے لئے استعمال کر سکتے تھے۔ آج کل بھی جو لوگ کار ہی کو بھگوان مانتے ہیں۔ وہ

ان شبدوں کو پھر سے ان ہی معنوں میں استعمال کر سکتے ہیں ۔

"ستنکار"........ وہ آدمی جو سات کاریں رکھتا ہو اُسے "ستنکار" کہتے ہیں۔

آج کل یہ لفظ بمعنی مان یا عزت استعمال ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پُرانے زمانے میں جو آدمی سات کاریں رکھتا تھا صرف اُسی کی عزت کی جاتی تھی، مگر آج کل ایسا بُرا زمانہ آن لگا ہے کہ جو آدمی صرف ایک کار رکھتا ہے اُس کی بھی عزت کی جاتی ہے ۔

"ہاہا کار"........ کار والے سے جب کوئی حادثہ ہو جائے تو اُسے ہاہاکار کہتے ہیں۔ آج کل ہر طرح کے حادثے کو کہتے ہیں ۔

"جے جے کار"...... پُرانے زمانے میں اگر لیڈر پیدل تقریر کرنے آتا تھا۔ تو لوگ اُس کی صرف جے بلاتے تھے اور اگر کار پہ آتا تھا تو جے جے کار بلاتے تھے۔ آج کل بھی یہی ہوتا ہے ۔

"جھٹکار"..... بڑھیا گاڑی کو کہتے ہیں، جیسے امپالہ، جو دراصل دھرمپالہ کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے ۔

"اہنکار"...... پُرانے زمانے میں گاڑی رکھنے والے اپنے آپ کو دوسروں سے کچھ مختلف اور اونچا سمجھنے لگتے تھے اور اُن کے دل دوسروں کے لئے حقارت اور اپنے لئے غرور سے بھر جاتے تھے۔ چنانچہ پراچین

زمانے میں کار والوں کے اس غرور کے لئے اہنکار کا شبد استعمال ہوتا تھا آج کل ہر طرح کے غرور کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ حالانکہ صحیح وہی تھا۔

"ودیا النکار"...... جو کار کی ودّیا جانتا ہو۔ یعنی کاروں کا گیان رکھتا ہو۔ آج کل ہر طرح کے گیانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

"دھکار"...... آدھی رات کے وقت جب کار فیل ہو جائے۔ اور آپ کو دھکا لگانا پڑے، ایسے موقعوں کے لئے دھکار کا شبد بولا جاتا تھا۔ آج کل معنے کچھ بدل گئے ہیں۔ لیکن اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کچھ زیادہ نہیں بدلے۔

اوپر کے چند شبد میں نے پرانی شبداولی سے نکال کے دکھائے ہیں۔ لیکن اس سے آپ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ کار صرف آریاؤں اور ہندوؤں کے زمانے میں موجود تھی۔ کار تو مغلوں کے زمانے میں بھی موجود تھی اور محمد شاہ رنگیلا کے عہد تک استعمال ہوتی رہی۔ اتفاق سے اسی زمانے میں نادر شاہ نے دلی پر حملہ کیا اور زر و جواہر کے علاوہ اُس زمانے کی تمام اچھی اچھی کاروں کو لوٹ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ ویسے دلّی اور لکھنؤ کی سڑکوں پر آج بھی کہیں کہیں ایسی کاریں نظر آجاتی ہیں۔ جو نادر شاہ کے زمانے ہی کی معلوم ہوتی ہیں۔

کار کا لفظ سنسکرت سے ہندی اور ہندی سے اُردو میں آیا ہے

لیکن مغل بادشاہوں اور ان کے عالموں اور اُردو والوں نے اپنی فطری صلاحیتوں سے کام لے کر اس میں سینکڑوں تصرفات کئے ہیں۔ ہزاروں موشگافیاں، جن کا مفصل بیان اس وقت ممکن نہیں۔ نمونے کے طور پر چند لفظ پیش کرتا ہوں جو آج بھی ہندی اور اُردو میں کثرت سے استعمال کئے جاتے ہیں مگر معنی بدل کر۔ ان کے صحیح معنے میں نے ملا طاغوتی کی جسیم اللغات میں سے لئے ہیں (بدقسمتی سے اس لغت کا اب صرف ایک ہی نسخہ ملتا ہے اور ہر کتب فروش سے ملتا ہے وہی الفاظ وہی معنی زیر زبر کا بھی فرق نہیں۔ ایسے نامساعد حالات میں تحقیق کی گنجائش کہاں رہتی ہے)

شاید یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ مغل بادشاہوں کو گھنے جنگلوں میں جاکر جانوروں کو مارنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اس کام کے لئے اکثر کار استعمال کیا کرتے تھے اور کار کی مناسبت سے جنگلی جانوروں کو مارنے کے کھیل کو "شکار" کہتے تھے۔ یہ لفظ آج بھی انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اب شکار کے لئے کار کی کوئی شرط نہیں رہی۔ اب چاہے کار پر جائیے یا ہاتھی گھوڑے پر، پیدل چل کر، آپ بلا خوف وخطر، شکار کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں۔ بلکہ یار لوگ تو آج کل کسی تالاب کے کنارے بیٹھ کر مچھلی پکڑنے کے فعل کو بھی شکار کہنے لگے ہیں۔

اُس زمانے میں کار چلانے والے ملازم کو "کارندہ" کہتے تھے آج کل

ہر قسم کے ملازم کے لئے یہ لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے ۔

اُس زمانے میں نہ صرف بادشاہوں کے پاس کاریں ہوتی تھیں بلکہ امیروں اور نوابوں اور جاگیرداروں کے علاوہ بڑے بڑے سرکاری ملازموں کے پاس بھی کار ہوتی تھی ۔ چنانچہ اسی مناسبت سے ان بڑے بڑے سرکاری ملازموں کو "اہل کار" کہا جاتا تھا ۔ اور ان سے بھی بڑے نوابین کو "سرکار" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا ۔ اور جو لوگ آگے بڑھ کر امیروں کی کار کا دروازہ کھولتے تھے انہیں "پیشکار" کہا جاتا تھا ۔

اُس زمانے میں اردو اور ہندی کے ہر ادیب کے پاس ایک کار ہوا کرتی تھی ۔ چنانچہ اُسی کار کے رشتے سے وہ اگر اردو کا ادیب ہے تو "قلمکار" کہلاتا تھا ۔ اور اگر ہندی کا لیکھ ہے تو "ساہتیہ کار" کہلاتا تھا ۔

آج کی سی حالت نہ تھی ۔ کہ گاڑی تو ہے نہیں مگر بنے پھرتے ہیں ادیب اور کلاکار ۔

اب کچھ ایسے الفاظ پیش کرتا ہوں جو ہیں تو پرانے لیکن اپنے معنی کے اعتبار سے ذرا سے تصرف سے انتہائی ماڈرن اور جدید بنائے جا سکتے ہیں موجودہ لغات میں اگر مندرجہ ذیل تبدیلیاں کر لی جائیں تو زندگی کی بہت سی حقیقتیں زیادہ واضح ہو سکیں گی ۔

"نابکار" ... وہ لوگ جو گاڑی پر پتھر پھینکتے ہیں ۔

"تونکار"...... جب دو گاڑیوں کے ڈرائیور راہ چلتے ہوئے ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں۔

"پھٹکار"..... پرانی گھسی پٹی کار۔

"مکار"...... وہ آدمی جو کسی دوسرے کی کار کو اپنی بتائے۔

"پکار"...... ہارن کی آواز جب بیٹھی ہو تو "پکار" کہلاتی ہے تیز ہو تو للکار بن جاتی ہے۔

"انکار"...... جب کار والا کسی بہانے سے اپنے دوست کو گاڑی نہ دے

"بدکار"..... وہ آدمی جو کار میں بیٹھ کر عورتوں کو گھورتا ہے

"نکو کار"..... جو ایسا نہ کرے

"بیکار"...... وہ جدوجہد جو گاڑی کے حصول میں کرنا پڑتی ہے۔ حاصل ہوتے پر اُسے "بیکار" کے بجائے "بیکارڈ" بھی کہہ سکتے ہیں۔

"کارنامہ"........ نامہ یعنی وہ خط جو کار میں بیٹھ کر لکھا جائے۔

"پُرکار"......... ایک سے زیادہ کاریں رکھنے والے کو "پرکار" کہا جائے" اور پیدل چلنے والے کو سادہ۔ تو سادہ اور پُرکار کی ترکیب سمجھ میں آئے نہ آئے اس کا تضاد ضرور واضح ہو جائے گا۔

"ہدکار"....... وہ کار جس کو اپنے در پہ کھڑی دیکھنے کی تمنا آپ کو جانے کب سے ہے۔

"مکار" .... وہ حضرت جو کسی دوسرے کی گاڑی کو اپنی بتا کر آپ کو چکمہ دے گئے۔

لیکن وہ پرانے زمانے لد گئے۔ نئے زمانے کی گاڑیوں کو کیا کہوں۔ اقبال نے کہا ہے: "کارِ جہاں دراز ہے" یہ غالباً آج کل کی لمبی گاڑیوں کی طرف اشارا ہے۔ آج کل جوں جوں کاریں لمبی ہو رہی ہیں انسانوں کے دل چھوٹے ہو رہے ہیں۔

"ایسے میں کون غریب آدمی کو لفٹ دیتا ہے .... آئیے بس کے اڈے پر چل کر کھڑے ہوں۔

لکھ پتی بننے کا نسخہ

جب میں آٹھویں میں چوتھی بار فیل ہوا تو گھر سے ایک ہزار روپے اور کچھ زیور چرا کر بمبئی بھاگ آیا۔ یہاں تین مہینے میں ٹائپنگ کا کام سیکھ کے میں نے ایک دفتر میں عرضی داغ دی۔ کمپنی کا مالک میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اور بولا

"مگر ہم کو تو ایک لڑکی چاہیئے۔"

میں نے کہا۔ آج کل لڑکی اور لڑکے میں زیادہ فرق تو نہیں رہا۔ لڑکیاں

پتلون پہنتی ہیں۔ میں بھی پہنتا ہوں۔ لڑکیاں بش شرٹ نما بلاؤز پہنتی ہیں میں بلاؤز نما بش شرٹ پہنتا ہوں ان کے بال کٹے ہوئے ہوتے ہیں میرے بال بھی کٹے ہوئے ہیں پھر میں کس طرح کسی لڑکی سے کم ہوں؟

کمپنی کے مالک نے میرے سامنے میری عرضی کے چار ٹکڑے کر دئے اور بولا تم تو احمق ہو۔ چلے جاؤ۔

میں چلا آیا۔ پھر میں نے تین مہینے کا کورس لے کے بجلی کے پنکھوں کی مرمت کا سیکھا اور کام سیکھ کر ایک کمپنی میں عرضی دی جو یہی کام کرتی تھی۔

کمپنی کا مالک بولا "کیا بجلی کے پنکھے کے پرزے توڑ سکتے ہو؟"

"جی نہیں۔ جوڑ سکتا ہوں"

"کیا تم بجلی کے پنکھے اس طرح جوڑ سکتے ہو کہ ہر تیسرے مہینے پھر ان کی مرمت کی ضرورت پڑ جائے؟" صاحب نے پھر پوچھا۔

"جی نہیں!" میں نے فخریہ لہجہ میں کہا۔ میں تو بجلی کا پنکھا ایسا عمدہ مرمت کر کے دوں گا کہ ایک سال تک تو اس کا ایک پرزہ تک خراب نہ ہوگا"

تو پھر تم ہمارے کام کے آدمی نہیں ہو۔ صاحب نے جواب دیا اور میری عرضی کے آٹھ ٹکڑے کر دئے۔

اس کے بعد، مسٹر کچل اسٹیل میل کے دفتر میں گیا اور بڑے صاحب سے جا کر بولا "مجھے کام چاہیئے"

"کیسا کام؟" وہ بولے

"کیسا بھی کام ہو میں کروں گا" میں نے جواب دیا۔

"وہ بولے مگر تم کیا کام کر سکتے ہو؟"

میں بولا "میں فرش پر جھاڑو دینے کے کام سے لے کر آپ کے دماغ میں جھاڑو پھیرنے تک کا کام کر سکتا ہوں۔

میرا جواب سن کر وہ مسکراتے بولے

"تمہارے جواب سے معلوم ہوتا ہے، تم سیٹھ کستوری چند کے داماد ہو"

میں نے کہا، "جی نہیں"

وہ بولا "تو پھر تم ضرور دھنوری چند کے نواسے ہو"

میں نے کہا "میں وہ بھی نہیں ہوں"

وہ بولا، "تو پھر ضرور تم سیٹھ فتوری چند کے ممیرے بھائی کے خلیرے بھائی کے چچیرے بھائی کے پھپھیرے بھائی کے ...... اس کا دم پھول گیا

میں نے کہا "جی میں وہ بھی نہیں ہوں"

تو کڑک کر بولا تو پھر تم یہاں کیا کرتے ہو؟ گیٹ آؤٹ"

گیٹ آؤٹ ہو کر میں چلنے لگا اور چلتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب کیا کروں ماں کے زیور ختم ہو چکے تھے اور ایک ہزار میں سے صرف ایک سو بارہ روپے

بچے تھے۔

چلتے چلتے سہ پہر کے قریب مجھے سخت بھوک لگی تو میں ایک اسپورٹس کی دوکان میں گھس گیا۔ دوکان میں کرکٹ، ہاکی، فٹ بال اور ٹینس کے سامان کے ساتھ ساتھ کانچ کے ایک خوبصورت برتن میں گول گول سفید رس گلے رکھے تھے۔ میں نے ان کی طرف کر کے دوکاندار سے کہا۔ "بڑے احمق ہو۔ اسپورٹس کی دوکان میں رس گلے رکھتے ہو؟"

وہ بولا "یہ بمبئی ہے۔ یہاں سب کچھ چلتا ہے"

میں نے کہا "مجھے دو روپے کے رس گلے دو۔

اس نے دو روپے لے کر کانچ کے برتن میں سے دو رس گلے نکالے

وہ بولا "یہ اسپیشل ٹائپ کے رس گلے ہیں"

"تو چار دے دو"

اس نے مجھے ایک لفافہ میں چار روپے کے چار رس گلے دیئے۔ لفافہ لے کر میں باہر نکل آیا۔ آگے بڑھا تو ایک جوہری کی دوکان پر بڑے عمدہ کیلے نظر آئے۔ ہرے ہرے اور خوب موٹے تازے چمکتے ہوئے "میں نے کہا" عجیب آدمی ہو۔ جوہری کی دوکان پر کیلے رکھتے ہو۔"

وہ بولا "سونا بیچنا منع ہے اس لئے کیلے رکھتا ہوں"

"کیا بھاؤ دو گے؟" میں نے پوچھا

"چھ روپے درجن"

"چھ روپے درجن؟ میں نے حیرت سے چلا کر کہا" بارہ آنے کے بھاؤ سے بازار میں جتنے کیلے چاہو خرید لو۔"

مگر یہ اسپیشل ٹائپ کے کیلے ہیں!"

"اچھا تو ایک درجن دے دو۔"

اس نے ایک درجن کیلے ایک بڑے سے لفافے میں ڈال کر میرے حوالے کئے میں دوکان سے باہر نکل آیا اور میٹرو سینما کے سامنے کے میدان میں چلا گیا کہ کھلی دھوپ اور ہری گھاس پر بیٹھ کر اپنا کھانا کھا لوں۔

گھاس پر ایک کونے میں دوسرے لوگوں سے الگ تھلگ ایک جگہ تلاش کر کے میں وہاں بیٹھ گیا پہلے میں نے رس گلے والا لفافہ کھولا اور ایک رس گلا نکال کر منہ میں ڈالا۔ منہ میں ڈالتے ہی کچ کی سی آواز پیدا ہوئی اور مجھے معلوم ہوا کہ جسے میں رس گلا سمجھا تھا وہ دراصل ٹینگ پانگ۔ کی ایک گیند تھی ربڑ کی بنی ہوئی۔

میں نے مایوس ہو کر جلدی سے دوسرا لفافہ کھولا۔ معلوم ہوا کہ اس لفافے کے اندر جتنے کیلے تھے وہ سب پلاسٹک کے بنے ہوئے تھے، اب کیا کیا جائے؟

اب کیا ہو سکتا ہے! میں نے سوچا، پیسے تو میں خرچ کر چکا - اب تو جو کچھ مل گیا ہے، خدا کا شکر ادا کر کے کھا لینا چاہیئے اور اوپر سے پانی پی لینا چاہیئے، چنانچہ میں نے ریان کے رس گلے اور پلاسٹک کے کیلے چپا چپا کے کھا ڈالے کیونکہ رزق کی بے عزتی نہیں ہو سکتی اور رزق ہی کے لئے تو میں بمبئی آیا تھا کھاتے ہی مجھے بے حد پیاس لگی اور پیٹ میں عجیب سی اینٹھن ہونے لگی۔

اتنے میں قریب سے ایک چھوکرا گزرا اس کے ہاتھ میں ایک میلا سا تھیلا تھا- اس نے قریب آکر بڑے دھیرے سے کہا "پانی پی لو- دو روپے میں باٹلی۔"

میں نے اسے اپنے قریب بلایا اور اس سے پوچھا "کیا لوٹ مچی ہے بمبئی میں- پانی کی باٹلی دو دو روپے میں بیچتے ہو؟"

وہ بولا "یہ جوزف کا پانی ہے۔"

"جوزف کون ہے؟" میں نے اس سے پوچھا

"ہمارا مالک ہے۔" وہ بولا

"تو دو روپے میں پانی کی ایک باٹلی کیوں بیچتے ہو؟ جب کہ لاگزز کا ادرخ چھ آنے میں ملتا ہے؟"

"مگر یہ اسپیشل ٹائپ کا پانی ہے- پہلی دھار کا۔" وہ بولا-

میں نے پہلی دھار کا پانی آج تک نہیں چکھا تھا- چلو آج یہ بھی ہو جائے-

جیب میں ایک سو کے نوٹ کے علاوہ ابھی دو روپے باقی تھے۔ لہذا ایک باٹلی خرید کر حلق میں انڈیل لی۔ حلق میں جاتے ہی ایسا لگا جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے دماغ میں جتنے جالے تھے سب صاف ہو گئے ہر چیز روشن واضح اور اپنی صحیح صورت میں دکھائی دینے لگی۔ میں ایک چھلانگ لگا کر اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا اور سو کے نوٹ کو اپنی مٹھی میں لے کر سیدھا کالبا دیوی روڈ کے کاٹن ایکسچینج کی طرف بھاگنے لگا۔

کاٹن ایکسچینج کے اندر عجیب بھگدڑ مچی تھی۔ غل غپاڑہ۔ نوچ کھسوٹ لوگ ایک دوسرے کے قریب ایک فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہو کر بھی اس طرح چلاتے تھے جیسے ان کا مخاطب ان سے ایک سے ایک ہزار گز کی دوری پر ہو۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے " لیا۔ دیا۔ بیچا۔ خریدا۔ منڈی پڑھتی۔ سات اوپر آٹھ نیچے۔ چالیس ہزار گانٹھیں، ستر ہزار گانٹھیں ڈیڑھ لاکھ . . . . !"

" دو لاکھ !" میں غصے سے چلایا

ایک دلال میرے پاس آیا۔ بولا "بیچتے ہو؟"

" ہاں بیچتا ہوں " میں نے غرا کے کہا اور خریدتا بھی ہوں !"

"کس بھاؤ سے ؟ " اس نے مجھے شانے سے پکڑ لیا تاکہ میں بھاگ کر کسی دوسرے دلال کے پاس نہ چلا جاؤں۔

"سات اوپر نو نیچے۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔

سات اوپر نو نیچے؟ وہ خوشی سے چلایا

جیسے میری بات کا اُسے یقین نہ آیا ہو۔

"ہاں سات اوپر نو نیچے"، میں نے دہرا کر کہا۔

دلال خوشی سے چلّایا"، دو لاکھ گانٹھیں۔۔۔۔ دو لاکھ گانٹھیں" پھر ایک دم رُک کر میری طرف دیکھ کر بولا،" کس کی؟"

"عقل کی!"

"عقل کی، کوئی نیا برانڈ ہے۔ روئی کا۔"

اس نے میری طرف شبہ کی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا

"اسپیشل ٹائپ کا برانڈ ہے"، میں نے جواب دیا۔

"اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا" تم چرٹ رام اینڈ کمپنی کے آدمی ہو نا؟"

"اور کس کا دکھائی دیتا ہوں؟" میں نے گرج کر پوچھا۔ پہچانتے بھی نہیں ہو؟"

اس نے میرا کندھا تھپتھپا کر کہا" ایسے ہی پوچھ لیا تھا، صاحب جی، کھاطری کر لینا اچھا ہوتا ہے۔"

پھر وہ مجھے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا اور اپنے سے تین فٹ کے فاصلے

پر کھڑے ہوئے آدمی کے کان میں پورا حلق پھاڑ کر بولا "دو لاکھ گانٹھیں چیرٹ رام اینڈ کمپنی دو لاکھ گانٹھیں ...... سات اُوپر نو نیچے!"

"اور بیچ میں صفر" وہ چلاتا ہُوا آگے بھیڑ میں غائب ہوگیا۔

کوئی آدھے گھنٹے تک میں بھیڑ کے کنارے باہر کھڑا یہ غل غپاڑہ دیکھتا رہا۔ اور جب میں مایوس ہوگیا کہ وہ دلال واپس نہیں آئے گا۔ تو میں باہر جانے کے لئے مڑا اتنے میں وہ دلال بھیڑ کو چیرتا ہُوا دوڑتا دوڑتا میرے پاس آیا اور آکر اس نے میرے ہاتھ میں باسٹھ ہزار روپے کے نوٹ تھما دئے بولا "میں نے اس میں سے کمیشن کی کٹوتی نہیں کی ہے۔"

میں نے کہا۔ تو کر لو نا۔"

"سیٹھ کو بولے بغیر؟ اس نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

"میں سیٹھ کو بول دونگا۔ وہ پونا گیا ہے۔"

"اچھا تو دو ہزار دے دو۔"

دو ہزار کٹوتی کے دے کر میں ساٹھ ہزار لے کر کاٹن ایکسچینج کے باہر ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے ٹیکسی والے سے کہا "چلو بمبئی کے باہر کہیں بھی چلو۔ اور دل میں سوچا کہ جیرٹ رام اینڈ کمپنی اور میرے درمیان جتنا فاصلہ بھی یہ ٹیکسی پیدا کر دے اتنا ہی اچھا ہے۔!

باندرہ کے قریب پہنچ کر مجھے بڑے زور سے پیشاب لگا پھر ٹیکسی

کے فرش پر نگاہ ڈالی مگر ٹیکسی ڈرائیور ایک بھاری بھرکم بڑی بڑی مونچھوں والا پٹھان تھا۔ اس لئے میں گھٹنے دے کے بیٹھ گیا اور ٹیکسی والے سے کہا لنکنگ۔ روڈ پر سڑک کے دورویہ بہت سے پلاٹ خالی تھے۔ یہاں ابھی تک بلڈنگیں نہیں بنی تھیں۔

ٹیکسی والے نے شہ پاکر زور سے ٹیکسی بھگائی ایک خالی پلاٹ کے قریب جاکر میں نے کہا "ٹیکسی روک دو"

ٹیکسی رکتے ہی میں تیر کی طرح ٹیکسی سے نکلا اور بھاگتا ہوا خالی پلاٹ کے اندر چلا گیا۔ اندر جاتے ہی ایک آدمی میرا راستہ روک کے کھڑا ہو گیا شکل وصورت سے وہ سندھی معلوم ہوتا تھا۔

"تم کیا پلاٹ خریدنے کو آیا ہے؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں" میں نے جلدی سے کہا مگر آگے سے ہٹ جاؤ ذرا۔"

"کتنے میں لوگے؟" وہ پھر میرا راستہ روک کر بولا۔

"جتنے میں دے دو میں نے کہا" مگر میں بہت جلدی میں ہوں۔ اس وقت آگے سے ہٹ جاؤ۔ ذرا مجھے فارغ ہو لینے دو۔"

"وڈی اتنی جلدی کیسے فارغ ہو جائے گا؟ وہ سندھی اپنی باچھیں کھلاتے ہوئے بولا " یہ پلاٹ سیٹھ شروانی کا ہے۔ ڈیڑھ لاکھ میں ملے گا۔ پچیس ہزار روپے ایڈوانس لیں گا ہم۔ آج ایڈوانس دے کر سودا پکا کر

جاؤ- وڈی باقی کل دے دینا- ہم سیٹھ شروانی کو ...... "

" ابے زیادہ شروانی مت کر مجھے تکلیف ہوتی ہے ..... " بے قرار ہو کر چلایا اور جیب سے پچاس ہزار کے نوٹ نکال کر بولا " یہ لے پچیس ہزار روپے ایڈوانس کے اور راستے سے ہٹ مجھے پلاٹ دیکھنے دے " میں نے جلدی سے اسے پچیس ہزار روپے دے اور پلاٹ میں پیشاب کیا اس کے بعد سیٹھ شروانی کا ایجنٹ مجھے اپنے آفس میں لے گیا اور اس نے پچیس ہزار کی رسید مجھے دے کر کہا " یہ رسید لے کر جاؤ کل تین بجے باقی روپیہ لے کر آؤ- کل تین بجے ہمارا سیٹھ شروانی اِدھر آئے گا- پلاٹ کا کاغذ تمہارے حوالے کرے گا "

میں نے بادل ناخواستہ رسید لے لی- اب کیا ہو سکتا تھا- میں نے پچیس ہزار میں پیشاب کیا تھا- دنیا کا سب سے مہنگا پیشاب ! پلاٹ خریدنے کے لئے باقی روپے میرے پاس کہاں تھے اس لئے میں نے رسید جیب میں ڈال لی اور کل آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہی ہونے والا تھا کہ دفتر کے باہر ایک کار آئی اور ایک موٹا گندمی رنگ کا آدمی زرد ٹریلین کا سوٹ ڈالے ہوئے بھاگتا بھاگتا اندر آیا اور ہانپتے ہانپتے بولا " او گلڈوانی- ڈی نمبر فائیو کا پلاٹ بیچا تو نہیں تو نے ؟ "

گلڈوانی سر سے پاؤں تک مسکراہٹ بن گیا- پچیس ہزار کے نوٹ اس

آدمی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا "سودا ہو گیا۔ پچیس ہزار ایڈوانس بھی مل گیا۔ سیٹھ یہ لو؟"

"کتنے میں بیچا؟"

"وہی، جتنے میں آپ نے بولا تھا۔ پورے ڈیڑھ لاکھ میں، ایک کم نہ ایک جیادہ۔!"

اس آدمی نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔ بولا "وہ سیٹھ فول چند کو ادھر سینما بنانے کا پرمٹ مل گیا ہے۔ وہ ادھر سینما باندھے گا۔ چار لاکھ میں پلاٹ لیتا ہے۔ ہمارا!"

"ہم تو اسے دے چکا سیٹھ شروانی گلڈانی کے چہرے کا بلب بجھ گیا۔

"اوہ" سیٹھ کے منہ سے بے اختیار مایوسی کے لہجہ میں ایک گہری آہ نکلی پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک کرسی پر گرا دیا اور خود قریب میں ایک کرسی کھینچ کر بولا "سیٹھ ہمارا نقصان مت کرو۔ یہ سودا کٹ کر دو۔"

"کیوں کروں؟" میں نے بڑی سختی سے انکار کیا۔

ہم تم کو اس سے ایک ہزار بڑا اور جاستی زمین کا پلاٹ ادھر باجو میں دیتا ہے۔"

"نہیں۔ ہم کو یہی زمین چاہیئے۔" میرے لہجے میں جاہک کی سی تیزی تھی۔ سیٹھ شروانی بے بسی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ "ہم تم کو پچیس ہزار کے

پچاس ہزار اپنی طرف سے واپس کرتا ہے..... پورے پچاس ہزار۔
"ہم کو پچاس ہزار نہیں چاہیئے یہی زمین چاہیئے۔

"اچھا ساٹھ ہزار لے لو!"

"نہیں۔!"

"ستر۔!

"نہیں۔!

"تو کیا لو گے تم؟ شروانی اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگا۔ اس کے چہرے سے ایک ایسی عجیب سی بو آ رہی تھی جو ان پیسوں سے آتی ہے جو بہت دیر تک کسی کی مٹھی میں دبے رہیں۔

"ففٹی ففٹی! میں نے کہا۔

ففٹی ففٹی کیا؟ وہ انجان بن کر بولا۔

میں نے کہا۔" تم اس زمین کی قیمت ڈیڑھ لاکھ لگاتا تھا مگر اب تم اس کا چار لاکھ ملتا ہے اس لئے ڈیڑھ لاکھ کے اوپر جو تم کو منافع ملتا ہے وہ آدھا تم لے جاؤ، آدھا ہم کو دو!"

سیٹھ شروانی نے چند لمحوں تک تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ پھر اس نے میرے پچیس ہزار کے نوٹ اپنی جیب میں ڈال لئے پھر اندر کی جیب ٹٹول کر اس میں سے ایک ٹھوا نکال کر ایک لاکھ کے نوٹ نکالے

سوا لاکھ میرے ہاتھ میں تھما کر بولا، سیٹھ تمہاری تقدیر اچھی تھی یہ لے جاؤ پھوکٹ میں — اور میری زمین چھوڑ دو"

میں سوا لاکھ جیب میں ڈال کر وہاں سے چلا آیا۔

بچپن میں مجھے اپنے گاؤں میں برف کے گولے بنانے کا بہت شوق تھا جب برف پڑ کر تھم جاتی تھی تو میں گھر کے باہر گھاٹی پر نکل کر برف کا گولا بنا کر اسے گھاٹی پر لڑھکاتا تھا۔ برف کا گولا بڑی تیزی سے لڑھکتا جاتا تھا۔ اور آس پاس کی برف کو اپنے اندر سمیٹتے ہوئے بڑا ہوتا جاتا تھا۔

یہی حال روپے کا ہے۔ ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے کو گولا بنا کر میں نے جو اسے بمبئی کی گھاٹی بنا کر لڑھکانا شروع کیا تو روپے کے ساتھ روپیہ ملتا چلا گیا اور اب تو اتنا بڑا گولا بن چکا ہے کہ میرے سنبھالے بھی نہیں سنبھلتا آج کل میرا شمار بمبئی کے بڑے بڑے لکھ پتیوں میں ہوتا ہے۔

چند دن ہوئے مجھے بھاگرالپور یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ ڈگری دیتے وقت وائس چانسلر نے مجھ سے درخواست کی کہ میں لڑکوں کو اپنی کامیابی کا راز بتاؤں۔ تقریر کرتے وقت میں نے طلباء سے کہا "لکھ پتی بننے کا۔ ایک ہی نسخہ ہے۔ محنت کرو۔ محنت کرو۔ محنت کرو۔ اور ایمانداری سے جیو"

مجھے اُمید ہے کہ یونیورسٹی کے طالب علم اور اس قصے کے پڑھنے والے ضرور میری نصیحت پر عمل کریں گے اور بڑے اچھے کلرک ثابت ہوں گے۔

میرا پسندیدہ صفحہ

کچھ لوگ صبح اُٹھتے ہی جماہی لیتے ہیں۔ کچھ لوگ بستر سے اُٹھتے ہی ورزش کرتے ہیں۔ کچھ لوگ گرم چائے کی پیالی پیتے ہیں۔ میں اخبار پڑھتا ہوں۔ اور جس روز فرصت زیادہ ہو اُس روز . . . .

تو میں اخبار کو شروع سے آخر تک مع اشتہاروں اور عدالت کے سمنوں تک پورا پڑھ ڈالتا ہوں یوں تو اخبار سارے کا سارا اچھا ہوتا ہے

لیکن عام لوگوں کے لئے اخبار کا ہر صفحہ اتنی دلچسپی نہیں رکھتا۔ میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں۔ جو اخبار میں صرف ریس کا صفحہ دیکھتے ہیں یا وہ صفحہ جس پر روئی تیل تِل لوہا۔ تانبا۔ پٹ سن۔ سونا۔ چاندی۔ گڑ۔ پاپڑ اور آلوؤں کے سوکھے تکلوں کے بھاؤ درج ہوتے ہیں اور ایسے بھی لوگ ہیں جو اخبار کا پہلا صفحہ پڑھتے ہیں جس پر اکثر بڑی بڑی سرخیوں میں چھاپا جاتا ہے بعض لوگ اخبار کے ہاتھ آتے ہی اُس کا اداریہ کھول کر پڑھتے ہیں جس میں آج ایک چیز کے حق میں لکھا گیا ہے تو کل اُسی ذمہ داری سے اس چیز کے خلاف ہو جائیں گے یار لوگوں نے اس صورت حال کا نام رائے عامہ رکھ چھوڑا ہے خیر اپنی اپنی سوجھ بوجھ ہے سچ پوچھئے تو مجھے اخبار کے ان صفحوں میں سے کوئی صفحہ پسند نہیں ریس کے ٹپ اکثر غلط نکلتے ہیں میں کئی دفعہ غچہ کھا چکا ہوں روئی پٹ سن اور پاپڑ کے بھاؤ بھی بدلتے دیکھتے ہیں۔ سونا یا چاندی کا بھاؤ بھی آج کل یوں بڑھ رہا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کونسی دھات اچھی ہے۔ سونا یا چاندی یہی حال ملوں کارخانوں اور بنکوں کے حصوں کا ہے ان میں اس قدر تیزی مندی دکھائی دیتی ہے کہ میں نے تو اب یہ صفحہ ہی پڑھنا چھوڑ دیا ہے پہلا صفحہ بھی میں نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے کبھی یہ میرا پسندیدہ صفحہ وہ ہے جو پہلا صفحہ اُلٹنے کے فوراً بعد آتا ہے یعنی دوسرا صفحہ جس پر صرف اشتہارات ہوتے ہیں میرے خیال میں یہ اخبار کا سب

سے سچا سب سے علیحدہ اور سب سے دلچسپ صفحہ ہوتا ہے یہ انسانوں
کے لین دین اور تجارتی کاروبار کا صفحہ ہے ان کی ذاتی مصروفیتوں اور
کاوشوں کا آئینہ دار ہے۔ ان کی زندگی کی ٹھوس سماجی حقیقتوں کا ترجمان
ہے یہاں پر آپ کو کار والے اور بے کار ٹائپسٹ اور بل مالک مکان
بیچنے والے گراج ڈھونڈنے والے اور ذاتی لائبریری بیچنے والے کتے پالنے
والے اور پچاس روپے کی ٹیوشن کرنے والے سبھی بھاگتے دوڑتے چیختے
چلاتے روتے پیٹتے نظر آتے ہیں یہ ہماری زندگی کا سب سے جیتا جاگتا
صفحہ ہے جس کا ہر اشتہار ایک مکمل افسانہ ہے اور ہر سطر ایک شعر
یہ ہماری دنیا کی سب سے بڑی سیرگاہ ہے جس کی رنگا رنگ کیفیتیں مجھے
گھنٹوں مسحور کئے رکھتی ہیں آئیے آپ بھی میرے اس پسندیدہ صفحے کی دلچسپیوں
میں شامل ہو جائیے دیکھئے یہ ذاتی کالم ہے۔ امریکہ سے نائی لان جرابوں کا
اسٹاک آگیا ہے بیوپاری فوراً توجہ کریں۔ آپ کہیں گے یہ تو کوئی ذاتی دلچسپی
کی چیز نہیں ہے بھئی ہمیں نائی لان جرابوں سے کیا لینا یہ صحیح ہے لیکن ذرا صنفِ
نازک سے پوچھئے جن کے دل یہ خبر سنتے ہی زور زور سے دھڑک اٹھے ہوں
گے اور ٹانگیں خوشی سے رمبا ناچنے لگی ہوں گی آج کل عورت دل میں نائی لان
کی وہی قدر و قیمت ہے جو کسی زمانے میں موتیوں کی مالا کی ہوتی تھی۔ آگے
چلئے۔ ڈارلنگ فوراً خط لکھو معرفت ایس ڈی گھر و بچہ ملازم پور کون

ڈارلنگ ہے وہ کس مصیبت میں ہے وہ کیوں اس کے گھر یا کسی دوست
یا کسی سہیلی . . . .
. . . کے ہاں خط نہیں بھیجوا سکتا - اخبار میں یہ اشتہار کیوں دے
رہا ہے - بے چارہ دیکھئے، کیسی مجبوریاں ہوں گی اس بیچاری لڑکی کے لئے
بھی وہ بھی میری طرح ہر روز یہ اخبار کھولتی ہو گی اس ذاتی کالم کو دیکھتی
ہو گی اور اپنے لئے کوئی خبر نہ پاکر کیسی اداس اور رنجور ہو جاتی ہو گی اور
آج جب وہ ذاتی کالم میں یہ خبر پڑھے گی تو کیسے چونک جائے گی خوشی
سے اس کا چہرہ کھل جائے گا مسرت کی سنہری ضیاء اس کی روح کے ذرے
ذرے کو چمکا دے گی اور بے اختیار اخبار کو اپنے کلیجے سے لگا لے گی اور
اس کی لانبی لانبی پلکیں اس کے رخساروں پہ جھک جائیں گی یعنی اگر اس کی لانبی
لانبی پلکیں ہوئیں تو ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی پلکیں نہایت چھوٹی چھوٹی
ہوں جیسے چوہیا کے بال ہوتے ہیں اور ماتھا گھٹا ہوا ہو کچھ بھی ہو
وہ ایس ڈی گھروبخہ کی ڈارلنگ ہے ایس ڈی گھروبخہ کون ہے اب
اس کے متعلق آپ اندازہ لگائیے ممکن ہے وہ کوئی بھڑوبونجہ ہو یا
معمولی کلرک ہو یا تان سین کی گولیاں بیچنے والا ہو یا نیلام پور میں رس
گلے اور بنگالی مٹھائی کی دکان کرتا ہو یا کسی بڑے مل کا مالک ہو وہ یہ
سب کچھ ہو سکتا ہے اور آپ اب سوچتے جائیے زندگی کس قدر دلچسپ

ہوتی جارہی ہے۔ اس سے اگلا کالم دیکھئے یہ مکانات کا کالم ہے یہ بھی بیحد
دلچسپ ہے کیونکہ آج کل مکان ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا لیکن یہاں آپ
کو ہر طرح کے مکان مل جائیں گے یہ دیکھئے میرے پاس سمندر کے کنارے
ایک بنگلے میں ایک علیحدہ کمرہ ہے لیکن میں شہر میں رہنا چاہتا ہوں اگر کوئی صاحب
شہر کے اندر مجھے ایک کمرہ دے سکیں تو میں انہیں سمندر کے کنارے اپنا کمرہ
دے دوں گا اور ساتھ کل ساز و سامان بھی جس میں ایک بڑا صوفہ دو ٹیبل
لیمپ اور ایک پیتل کا لوٹا بھی شامل ہے۔ لیجئے اگر آپ شہری زندگی سے
اکتا گئے ہیں تو سمندر کے کنارے جا رہیئے۔ اگر آپ سمندر کے کنارے رہنے
سے گھبراتے ہوں تو شہر میں جا کے رہئے یہ پیتل کا لوٹا تو کہیں بھی رہ سکتا ہے
یہ دوسرا اشتہار دیکھئے کرائے کے لئے خالی ہے نیا مکان آٹھ کمرے دو کچن
پانچ غسل خانے گیراج بھی ہے اور مکان کے اوپر ابھی چھت نہیں ہے
مگر اگلے مہینے تک تیار ہو جائے گی کرایہ دار فوراً توجہ کرتے ہیں۔ بلکہ
کپڑے بدل کر چلنے کے لئے آمادہ بھی ہو جاتے ہیں کہ اتنے میں آپ کی نظر
اگلی سطر پر پڑتی ہے لکھا ہے کرایہ واجبی مگر سال بھر کا پیشگی دینا ہوگا۔ کرایہ
سالانہ اٹھارہ ہزار؟ اور آپ پھر بیٹھ جاتے ہیں اور اگلا اشتہار دیکھتے
ہیں لکھا ہے عمدہ کھانا بہترین منظر کھلا کمرہ فرنیچر سے سجا ہوا بجلی پانی
مفت کرایہ سب ملا کے ساڑھے تین سو روپے ماہانہ آپ خوشی سے چلاّ

اُٹھتے ہیں مل گیا مل گیا مجھے ایک کمرہ مل گیا اور کس قدر سستا کھانا ساتھ میں
واہ واہ آپ فوراً خط لکھنے کی سوچتے ہیں اور پھر کلیجہ پکڑ کر بیٹھ جاتے
ہیں کیونکہ آگے لکھا ہے دلکشا ہوٹل دارجلنگ — ظاہر ہے آپ بمبئی
میں نوکر ہیں۔ دلکشا ہوٹل دارجلنگ میں ہے۔ دارجلنگ میں رہ کر آپ
بمبئی میں نوکری نہیں کر سکتے۔ خیر چلیئے اگلا کالم دیکھئے یہ اگلے دو کالم
ضرورت ہے کے اشتہاروں سے بھرے پڑے ہیں۔ جس میں ایک خوبصورت
ٹائپسٹ گرل کی ضرورت ہے ایک پڑھے مدراسی اکاونٹینٹ کی ضرورت
ہے جو کناری زبان کے علاوہ تامل تیلگو ملیالم سنہالی اور عربی بھی جانتا
ہو تنخواہ ستر روپے ماہوار ایک کمپونڈر کی ضرورت ہے جو کم از کم ایم بی بی ایس
ہو اور اگر ولائت سے ایم ار سی اور ایف آر سی ایس بھی ہو تو اسے پانچ
روپے سالانہ ترقی بھی دی جائے گی ایک چپڑاسی کی ضرورت ہے جسے
چالیس روپے تنخواہ دی جائے گی اُردو اخبار کے لئے ایک ایڈیٹر کی
ضرورت ہے جسے تیس روپے ماہوار ملیں گے ایک راجہ صاحب کو سیکرٹری
کی ضرورت ہے جو اُن کے لئے اسمبلی کی تقریریں لکھ سکے ایک جادوگر کی
ضرورت ہے۔ جو ان کا دل بہلا سکے ایک لیڈی کمپنین کی ضرورت ہے جو گھوڑے
کی سواری جانتی ہو اور گلمرگ کے ہوٹلوں سے واقفیت رکھتی ہو ایک
فنڈ کی ضرورت ہے جو بڑے سوراخ میں چھوٹی کیل گاڑ سکے ایک انجینیر کی

ضرورت ہے۔ چھوٹی کیل کے لئے بڑی سوراخ کر سکے ایک باورچی کی ضرورت ہے۔ جو گوشت کے بغیر شامی کباب بنا سکے ایک دھوبی کی ضرورت ہے جو قمیص پھاڑ سکے لیکن بٹن سالم رکھے اور اعلیٰ القیاس یہی وہ کالم ہے جسے پڑھ کر مجھے اپنے سماج کی نیرنگیوں اس کی پستیوں اور بلندیوں چیرہ دستیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو کچھ دنیا میں آپ کے ارد گرد ہو رہا ہے اس کی سچی تصویر آپ کو انہی کالموں میں ملتی ہے۔ اخبار کے باقی صفحے تو خواہ مخواہ بیکار جھوٹ بول کر ہمارا وقت ضائع کرتے ہیں اس سے اگلا کالم موٹروں کتابوں اور کتوں کا ہے اس میں آپ دیکھیں گے کہ ایک ہی ماڈل کی نئی گاڑی ہے مگر وہ دو مختلف داموں میں بک رہی ہے۔ سیٹھ حسن لال کی گاڑی سات ہزار میں بکاؤ ہے کیونکہ وہ اسے بیچ کر کوئی دوسرا ماڈل لینا چاہتے ہیں اور وہی گاڑی مسٹر میکڈانلڈ کے پاس ہے اور وہ اُسے دو ہزار میں بیچے دے رہے ہیں کیونکہ مسٹر میکڈانلڈ ولایت جا رہے ہیں۔ ایک خوبصورت ALSATION کتا ہے جو ڈیڑھ سو میں بکتا ہے شیکسپیئر کے ڈراموں کا با تصویر سٹ ہے جو دس روپے میں جا رہا ہے یہ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ کتوں کے دام کتابوں سے کہیں زیادہ ہیں اور یہ بھی کہ اس کالم میں موٹروں اور کتوں کے خریدنے اور بیچنے والے تو بہت ملتے ہیں لیکن

کتابوں کے صرف بیچنے والے نظر آتے ہیں خریدنے والا کوئی نہیں
جتنے اشتہار ہیں سبھی کتابوں لائبریریوں اور ادبی خزینوں کے بیچنے
والوں کے اشتہار ہیں اس سے ہمیں اپنے ملک کے عظیم کلچر کا اندازہ
ہوتا ہے۔ اس صفحے کا سب سے آخری کالم جسے میں سب سے پہلے
پڑھتا ہوں شادی کا کالم ہے۔ بر کی ضرورت ہے۔ ایک نوجوان حسین
اٹھارہ سالہ گریجویٹ لڑکی کے لئے بر کی ضرورت ہے ایک خوبصورت
خاندانی لڑکی کے لئے جس کا باپ ایک مل کا مالک ہے لڑکا اچھا
ہونا چاہیئے ذات پات کی کوئی تمیز نہیں۔ اور میں بھی ذات پات کی
پرواہ کئے بغیر ہر جگہ عرضی بھیجنے کی سوچتا ہوں کہ اتنے میں میری بیوی
سر پہ آن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور مجھ سے پوچھتی ہے یہ کیا پڑھ رہے
ہو؟ اور میں ایک حزیں مسکراہٹ سے اپنا پسندیدہ صفحہ بند کر دیتا ہوں

٥

نیکی کی گولیاں

کیا ہے ؟

میں نے کسی قدر حیرت اور گھبراہٹ سے اس کی طرف دیکھ کر کہا کیوں کہ وہ ایک عجیب سا آدمی تھا، جو چپ چاپ بے آواز قدموں سے میرے باغیچے میں آگیا تھا، جہاں میں اور میری بیوی ناشتے کے بعد صبح کی دھوپ کھانے بیٹھے تھے۔

اُس کا چہرہ لمبوترا اور اُداس تھا اور رخساروں پر گہری شکنیں تھیں۔

ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے۔ اُس کی بڑی بڑی خوف زدہ آنکھوں میں کچھ ایسی گھبراہٹ تھی جیسے وہ ابھی ابھی کہیں سے کوئی جرم کر کے آ رہا ہو، یا جرم کرنے جا رہا ہو — !

اُس کا لباس بھی بے حد عجیب تھا — وہ انتہائی سفید رنگ کا ایک چوغہ پہنے ہوئے تھا اُس کے پاؤں میں سفید چپل تھے۔ اپنے ہات میں وہ سفید رنگ کا ایک تھیلا اُٹھائے ہوئے تھا۔ لیکن اس کے لباس میں سب سے عجیب اس کے دو پر تھے جو اس کے کندھوں پر اُگے ہوئے معلوم ہوتے تھے — انتہائی سفید اور شفاف نازک سے پر ..... دائیں بائیں کندھوں پر بڑی بے چینی سے پھڑپھڑا رہے تھے — !

کیا یہ پر اصلی ہیں .....؟" میں نے اس سے پوچھا

"جی نہیں۔" وہ ماتھے سے پسینہ پونچھ کر بولا۔" یہ پر نائی لان کے ہیں — !"

"کیا نائی لان اب جنت میں بھی پہنچ گیا؟" میری بیوی نے اس سے پوچھا۔

"جی نہیں،" اُس نے اپنے پھیکے ہونٹوں سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔" میں جنت سے نہیں آ رہا ہوں۔ میں تو اعجاز کیمیکل ورکس کا سیلز مین ہوں۔ یہ پر تو ہماری کمپنی کا ٹریڈ مارک ہے!"

اور صبح صبح یہ سیلزمین گلے پڑا — ! میرا دم اندر ہی اندر گھٹ کے رہ گیا۔ مگر اب بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی، کیونکہ اب وہ میرے سامنے کھڑا تھا اس لئے مجبور ہو کر مجھے پوچھنا پڑا۔

"کیا بیچتے ہو..... ؟"

"نیکی کی گولیاں بیچتا ہوں !"

"نیکی کی گولیاں ؟" —— میں نے حیرت سے تقریباً چیخ کر کہا

میری بیوی بھی آنکھیں پھاڑے بڑے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی ..... پھر کسی قدر خفا ہو کر بولی۔

"یہ کیا مذاق ہے ؟"

"مذاق نہیں ہے حقیقت ہے"، اس نے بڑے ٹھنڈے اور سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ "ہماری کمپنی کے سائنس والوں نے ریسرچ کرتے ہوئے ہمالیہ کے پہاڑوں میں سے ایک ایسی بوٹی دریافت کی ہے جس کی جڑوں میں ایک ایسا حیرت انگیز مادہ پایا جاتا ہے جسے کھاتے ہی آدمی نیک ہو جاتا ہے !"

"نیک —— ؟" میری بیوی نے بڑی حیرت سے پوچھا۔ کیونکہ اسے یقین نہیں آ رہا تھا —— !

"ہاں نیک بخت۔" میں نے اُسے سمجھایا۔ "وہ یہی کہہ رہا ہے —!"

"تم چپ رہو ـــــ تم سے کون پوچھ رہا ہے ؟" میری بیوی نے بات کے اشارے سے مجھے گویا زیرِ بحث موضوع سے خارج کرتے ہوئے کہا ـــ

"کس طرح کی نیکی ؟" اُس نے پھر سیلز مین سے پوچھا۔

وہ بتانے لگا" ہر طرح کی نیکی! آدمی کا ذہن خوبصورت اور نیک ہو جاتا ہے ـــ یک لخت اُس کے دل میں دوسروں کے لئے نیک اور عمدہ خیال آنے لگتے ہیں ـــ انسان کی ساری فطری خود غرضی اور کمینگی اور بے ایمانی دور ہو جاتی ہے۔ اس کے مجرمانہ عزائم اس کے تحت الشعور میں بڑی سختی سے دبا دیئے جاتے ہیں ـــــ یہ دوا اس قدر موثر ہے کہ اسے کھا کر آدمی کبھی چوری نہیں کر سکتا نہ کسی کا قتل کر سکتا۔ کسی پر حملہ نہیں کر سکتا۔ کسی کا بُرا نہیں سوچ سکتا ـــــ !"

"تو اس کا یہ مطلب ہے" میں نے اس سے کہا " اگر ساری دنیا کے انسان یہ دوا کھا لیں تو دنیا سے برائی نیست و نابود ہو جائے کبھی کسی پر ظلم نہ ہو کبھی کوئی کسی کا حق نہ مارے۔ کبھی کوئی جنگ نہ ہو ـــ !"

"نظریاتی طور پر یہ ممکن ہے" ـــ وہ اپنے پر پھڑپھڑاتے ہوئے بولا" لیکن عملی طور پر یہ ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ بوٹی بہت نایاب ہے اور اس کی جڑوں سے بہت کم مادہ نکلتا ہے ـــ!"

"تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس ــــ اس نیکی کی بوٹی سے مادہ الگ کر لیا جائے ــــ اور پھر اس کے کیمیائی مطالعہ سے بالکل وہی مادہ - نیکی کا مصنوعی طور پر تیار کر لیا جائے جیسے سائنس والوں نے "سرپ گندھا" بوٹی سے مصنوعی مادہ SERPINA تیار کر لیا ہے ــــ !"

"ہمارے سائنس والوں نے کوشش تو بہت کی ہے۔ مگر وہ ابھی تک اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ وہ مادہ تو بنا لیتے ہیں مگر نیکی بیچ ہی میں سے کہیں نکل جاتی ہے اور ہات نہیں آتی ہے۔ اسی لئے تو یہ نیکی کی گولیاں بہت قیمتی ہیں ــــ !"

کیا بھاؤ ہے ان کا ــــ ؟" میری بیوی کی خریداری کی رگ جاگی ۔ !

"چوبیس روپے میں دو گولیوں کا سیٹ ملتا ہے۔

سیلز مین نے تھیلے میں ہات ڈال کر ایک چھوٹی سی شیشی نکالی ۔ اس میں دو گولیاں چمک رہی تھیں ــــ سفید رنگ کی بلوریں گولیاں ــــ مٹر کے دانے کے برابر ــــ سیلز مین میری بیوی کے سامنے وہ شیشی ہلانے لگا۔

"جاؤ، جاؤ۔" میں نے تنک کر کہا "ہمیں نہیں چاہیئے ــــ !"

"چوبیس روپے بہت زیادہ ہیں" میری بیوی بھاؤ کرتے ہوئے بولی۔

چوبیس روپے کچھ زیادہ نہیں ہیں ــــ نیکی کی گولیوں کے لئے۔ سیلز مین بولا۔ "لوگ تو ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے خرچ کر دیتے ہیں،

نیک بننے کے لئے ..... وہ اسکول کھولتے ہیں۔ چندہ دیتے ہیں
مسجد تعمیر کرتے ہیں ـــــ تقریر کرتے ہیں۔ اخباروں میں اپنی تصویر
چھپواتے ہیں۔ دشمن سے ہات ملاتے ہیں۔ احمقوں کی پیٹھ تھپکتے ہیں
کسی عقیدے کے رسے پر اُلٹا لٹک جاتے ہیں نیک بننے کے لئے
..... مگر نیک نہیں بن سکتے! ـــــ مگر یہ دوا صرف چوبیس روپے
میں آپ کو بنا سکتی ہے ـــ!

"اس کا کیا ثبوت ہے؟" میں نے اس سے پوچھا

اس نے پھر جھولے میں ہات ڈالا۔ اور اس میں سے پہلی شیشی سے بھی
ایک چھوٹی شیشی نکالی۔ جس میں ریت کے ذروں سے ذرا بڑے اور ساگودانے
سے چھوٹے دانے بھرے ہوئے تھے ـــــ اس نے شیشی کی ڈاٹ کھول
کر اپنی ہتھیلی پر دو دانے نکالے اور ہتھیلی میرے سامنے پیش کرتے ہوئے
کہا ـــ

"ایک دانہ کھائیے"

اور پھر میری بیوی کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"ایک دانہ آپ بھی کھائیے ـــ کھائیے کھائیے، یہ سیمپل کی گولیاں
بالکل مفت۔ نمونے کے لئے ـــ دوا کا جادو دکھانے کے لئے ـــ کھائیے
اور کھاتے ہی دو منٹ میں اس کا اثر دیکھئے ـــــ!"

میری بیوی نے جلدی سے ایک دانہ اُٹھا کے اپنے منہ میں ڈال لیا۔ دوسرا دانہ میں نے بھی کسی قدر ہچکچانے کے بعد اپنی بیوی کے اصرار پر منہ میں رکھ لیا۔

دانہ منہ میں آتے ہی گھل گیا — عجیب تلخ اور نمکین سا ذائقہ تھا پھر ایک عجیب بات ہوئی — میرا دورانِ خون ایک دم دھیما پڑ گیا۔ اعصاب گویا بالائی کی تہوں کے آنسو آنے لگے — اپنی بیوی کو دیکھ کر میں رقت آمیز لہجے میں خود بخود بول پڑا۔

پیاری میں تمہارا گناہ گار ہوں گذشتہ بیس سال سے میں تم سے طلاق لینے کی سوچ رہا تھا۔ مگر ہمت نہیں پڑتی تھی —!"

میری بیوی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی — " میں جانتی تھی ڈارلنگ اور دل ہی دل میں تم کو کمینہ اور خود غرض سمجھتی رہی۔ یہ سوچ کر کہ یہ ہوس کا بندہ میری جوانی کے مزے لوٹ کر اب بڑھاپے میں مجھے دھتا بتانا چاہتا ہے کئی دفعہ غصے میں میرا جی چاہا تمہارا گلا گھونٹ دوں —!

میں نے روتے ہوئے کہا " تم نے تو محض سوچا ہی تھا۔ لیکن میں نے تو ایک دفعہ تقریباً سوتے میں تمہارا گلا گھونٹ ہی دیا تھا۔ مگر عین وقت پر میرے ہاتھ کانپ گئے۔ جانم میں تمہارے لائق نہیں ہوں —!"

" نہیں۔ تم بہت اچھے ہو — " وہ میرے گلے سے لگ کر بولی۔

"بری تو میں ہوں۔ میں تمہیں کبھی کوئی سکھ نہ دے سکی۔ اپنی پانچوں بہنوں کی تعلیم کا خرچ تم سے دلوایا۔ اور تم ایسے بے غرض تھے کہ آنکھیں بند کئے ہمیشہ میرے کہنے پر عمل کرتے رہے ۔۔۔ !"

"نہیں ۔۔ میں بھی مکمل بے غرض نہ تھا۔ جانم ۔" میں اقبال کرتے ہوئے بولا۔ "تمہاری بہنوں سے میرے تعلقات مکمل بے غرضی کے نہیں تھے ۔۔ شاید تم نہیں جانتی ہو ۔۔۔ حالاں کہ اب ان بے چاریوں کی شادی ہو چکی ہے۔ اور اب کچھ کہنا بھی نہ چاہیئے ۔۔ مگر۔ ۔ ۔ !"

"کچھ مت کہو ۔" میری بیوی میرے منہ پہ ہات رکھتے ہوئے بولی "میں سب جانتی ہوں اور جانتے ہوئے بھی تمہیں معاف کرتی ہوں ۔۔۔۔ تم چاہو۔ تو تم اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ابھی پوری کر سکتے ہو۔ تم چاہو تو میں ابھی ایک کاغذ پہ ایک کورے کاغذ پہ اپنے ہات سے دستخط کر کے تمہیں ایک ایسا بیان لکھ کے دیتی ہوں جسے عدالت میں پیش کرنے سے تمہیں فوراً مجھ سے طلاق مل جائے گی ۔ !"

وہ کاغذ لانے کے لئے اندر جانے کے لئے مڑی کہ میں نے اُسے راستے ہی میں روک لیا اور اس کی کمر میں ہات ڈال کر بولا ۔۔ "نہیں جانم اس کی ضرورت نہیں ہے ۔۔۔ اب وہ خیال بھی ہمیشہ کے لئے رد کر چکا اب تو ۔۔۔ اب تو ۔۔۔ ابن یہ کیا ۔۔۔ ؟"

یکایک میں اور میری بیوی دونوں حیرت سے ایک دوسرے کو تاکتے رہ گئے ۔ دوا کا اثر یکایک زائل ہو گیا تھا۔ اور ہم دونوں پھر ایک دوسرے کے لئے، میاں بیوی تھے۔ خشک، روایتی، اکتائے ہوئے اور تضحیک آمیز لہجے .... میں نے گھبرا کر اپنا ہات اپنی بیوی کی کمر سے کھینچ لیا — اور شرمندہ ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا — کچھ پریشان اور بھونچکا سا بھی تھا۔ یہ چند منٹ کے لئے مجھے کیا ہو گیا تھا — میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا — وہ بھی سر جھکائے غالباً کچھ یہی سوچ رہی تھی — !

نمونے کی دوا کا اثر صرف تین منٹ تک رہتا ہے —" سیلزمین بولا۔ مگر پوری گولی کھانے سے تین گھنٹے تک اثر رہتا ہے !"

نیکی کے تین گھنٹے کیا تین منٹ بھی بہت ہوتے ہیں —" میں نے کہا "میں تو ڈر گیا تمہاری اس دوا سے مجھے نہیں چاہیئے یہ دوا — !"

میری بیوی بولی — "میرے خیال میں تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔ کبھی کبھی تم پر وحشت کا ایسا دورہ پڑتا ہے کہ میں ڈر جاتی ہوں — لے لو — تمہیں اس کی ضرورت ہے — !"

ضرورت تو تمہیں بھی ہے" میں نے اس سے کہا "کبھی کبھی ایسی بدکلامی پر اُتر آتی ہو کہ سارا محلہ کھڑا سنتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں تمہارے لئے دو گولیاں تو لے ہی لیتا ہوں — !"

اور میں تمہارے لئے ـــــ دو گولیاں۔ میری بیوی بولی۔

جب سیلزمین ہمیں نیکی کی دو شیشیاں دے کر اڑتالیس روپے لے چکا۔ تو میں نے اس سے پوچھا۔ "یہ گولیاں کب کھائی جائیں؟ اور پرہیز وغیرہ بھی بتاتے جاؤ ـــــ؟"

"کسی پرہیز وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بولا۔ جب آپ نیک بننا چاہیں تب آپ ایک گولی کھالیں یا کسی دوسرے کو کھلا دیں جسے اس کی ضرورت ہو مگر یہ خیال رہے کہ یہ گولی خالی پیٹ کم اثر کرتی ہے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو" میں نے مسکرا کر کہا ـــ "نیکی پیٹ بھرنے کے بعد ہی سوجھ سکتی ہے ـــــ!"

(۲)

اگلے چند دنوں میں شہر میں کچھ ایسے حیرت انگیز واقعات اور حادثات ہوئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ نیکی کی گولیاں جگہ جگہ اپنا اثر دکھا رہی ہیں۔

ایک دوکاندار نے اعلان کیا کہ وہ اب تک آٹے میں لکڑی کا برادہ ڈال کر بیچتا رہا ہے ـــ لکڑی کا برادہ بیچنے والے نے اعلان کیا کہ وہ لکڑی کے برادے میں گیروی مٹی ڈال کر سپلائی کرتا رہا ہے ـــ گیروی مٹی سپلائی کرنے والے نے اقبال کیا کہ وہ گیروی مٹی میں راکھ ڈال کر

بچتا رہا ہے۔ نتیجے میں پبلک نے تینوں دوکان داروں کا بائیکاٹ کر دیا۔

ایک انجن ڈرائیور نے نیکی کی گولی کھا کر اپنے فائرمین سے کہا ــــ "پچیس سال سے میں یہ گاڑی چلا رہا ہوں ـــ اور پچیس سال سے تم اس گاڑی کے انجن میں کوئلہ جھونک رہے ہو ــ میں یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتا ـــ آج سے تم گاڑی چلاؤ گے اور میں جھونکوں گا ـــ!"

فائرمین نے نیکی کی گولی کھائی تھی ـــ وہ رقت آمیز لہجے میں بولا۔ "تمہیں مجھ پر رحم آتا ہے۔ مجھے اس انجن پر رحم آتا ہے۔ ذرا سوچو تو پچیس سال سے یہی انجن اس گاڑی کو ڈھو رہا ہے۔ اس کے انجر پنجر ڈھیلے ہو چکے ہیں۔ مگر حکومت اسے آرام نہیں دیتی۔ اسے ریٹائر نہیں کرتی۔ کتنا بڑا ظلم ہے ـــ!"

"تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔" انجن ڈرائیور سسکتے ہوئے بولا۔ "واقعی اس انجن کو ریٹائر کر دینا چاہیئے۔ میں ابھی اگلے اسٹیشن کے یارڈ میں پہنچ کر اس گاڑی کو روک دوں گا ـــ!"

اگلے اسٹیشن پر پہنچ کر انجن ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ انجن کو گاڑی سے الگ کر دیا۔ اور ڈرائیور اور فائرمین دونوں بڈھے انجن کی بے بسی پر آنسو بہاتے رہے اور کسی طرح مسافروں کے کہنے پر گاڑی کو آگے لے جانے کے لئے تیار نہ ہوئے ـــ!

ایک مسافر نے راہ چلتے ہوئے جیب کترے کو بلا کر اپنا بٹوہ اس کے حوالے کر دیا ۔۔۔!

ایک فلم اسٹار نے اپنا بلیک کا روپیہ ظاہر کر دیا۔ انکم ٹیکس کے محکمے نے لینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ دونوں نیکی کی گولیاں کھائے ہوئے تھے ۔۔۔!

دو بزنس مین نیکی کی گولیاں کھا کر بزنس کرنے بیٹھے۔ ایک لوہے کی مل مالک تھا دوسرا مینگینز کی کانوں کا، لوہے والے کو مینگینز کی ضرورت تھی اور مینگینز والے کو لوہے کی، کیوں کہ وہ ایک بڑا گودام بنانا چاہتا تھا۔ قاعدے بزنس ٹھیک ہو جاتا، مگر چونکہ دونوں نیکی کی گولیاں کھائے ہوئے تھے، اسی لئے گفتگو کچھ اس طرح ہونے لگی ۔۔ !

لوہے والا :۔ تم کو مالوم ہے رجاق بھائی۔ ہم نے پچھلے سودے میں تم کو دو لاکھ کا دھوکا دیا۔

مینگینز والا :۔ مجھ کو معلوم ہے چمن سیٹھ ۔ مگر اس سے پہلے سودے میں ہم نے تم کو تین لاکھ کا جھٹکا دیا۔ مگر آج تم کو میں ایک لاکھ واپس کرنے آیا ہوں ۔۔۔!

لوہے والا :۔ نہیں رجاق بھائی میں نہیں لوں گا ۔۔۔!

مینگینز والا :۔ تم کو لینا پڑے گا۔ چمن سیٹھ ۔ خدا کی قسم میں گناہگار

ہوں تم سے بھی بڑا گناہ گار — مگر آگے کو میں ایسا
دھندا نہیں کروں گا۔ تم بولو تم کو کتنا مینگنیز چاہیئے
میں دوں گا — !

لوہے والا :— تم بولو تم کو کتنا لوہا چاہیئے۔ ساری مل تمہاری ہے

مینگنیز والا — کیا بات کرتے ہو چمن سیٹھ۔

لوہے والا — جھوٹ نہیں بولتا ہوں۔ تم کو چاہیئے ابھی تمہارے
نام اکھٹی مل کرکے دیتا ہوں — !

مینگنیز والا — میں اپنی کھان کا سارا مینگنیز تم کو دیتا ہوں ابھی لے
کے جاؤ — ابھی کا ابھی — !

وہ اس کی نہ مانے۔ وہ اُس کی نہ سُنے۔ لوہے والے نے اپنی مل
مینگنیز والے کو لکھ دی — مینگنیز والے نے اپنی کانیں لوہے والے کے
سپرد کردیں — دوسرے دن جب دونوں کو ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ
لوہے والا اب مینگنیز والا تھا اور مینگنیز والا لوہے والا۔ مگر لوہے والے
کو پھر مینگنیز کی ضرورت تھی اور مینگنیز والے کو لوہے کی۔ اس لیئے
معاملہ جوں کا توں رہا بزنس کیا ہوا؟

ایک وزیر نے نیکی کی گولی کھا کر پریس کانفرنس بلا لی۔ اور اعلان
کیا کہ اُس نے اب تک اپنی گھپلے بازی سے دو کروڑ روپیہ جمع کیا ہے

اور یہ سب کا سب سوئٹرز لینڈ کے ایک بنک میں خفیہ طور پر جمع ہے
نیکی کی گولی کھانے کے تین گھنٹے کے بعد جب اسے ہوش آیا تو اس نے
پستول کی گولی کھائی ——!

آخری واقعے سے متاثر ہو کر حکومت بھی سخت اقدام کرنے پر مجبور
ہو گئی۔ پارلیمنٹ نے بل پاس کر دیا کہ جو شخص بھی نیکی کی گولی خریدتا
یا بیچتا پکڑا جائے گا اسے تین سال کی سزا دی جائے گی — نیکی کی گولی
کھانے والے کو پانچ سال کی سزا دی جائے گی۔ حکومت نے اعجاز
کیمیکل ورکس کی بلڈنگ ضبط کر لی —— گولیوں کو سمندر میں بہا دیا۔
اور سائنس دانوں کو ایک صحرائی علاقے میں جلا وطن کر دیا —— تب
جا کے کہیں ملک میں امن و امان قائم ہوا ——!

نیکی کے خلاف حکومت کے قانون کو نافذ ہوئے سات ماہ ہو گئے
تھے کہ میرے پاس ایک روز پھر وہی نائی لان کا فرشتہ آیا ——
لیکن اب اس کے پر غائب تھے، چوغہ بھی بدلا ہوا تھا اور جھولا بھی
غائب تھا۔

"اب کیا کرتے ہو —— ؟" میں نے اس سے پوچھا
"نیکی کی گولیاں اسمگل کرتا ہوں ——" اس نے آہستہ سے جواب
دیا اور اپنے حلق کے اندر ہاتھ ڈال کر دائیں گال کی جانب سے ربڑ

کی ایک چھوٹی سی تھیلی برآمد کی۔ اس تھیلی کے اندر زیپ لگی ہوئی تھی ــــ زیپ کھول کر اس نے وہی سفید سفید گولیاں برآمد کیں۔ نیکی کی گولیاں۔!

"ہٹاؤ۔ مجھے نہیں چاہیئے تمہاری نیکی کی گولیاں۔ میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

وہ بڑی رازداری سے میرے قریب جھکا اور جھک کر سرگوشی میں کہنے لگا۔" اب ہمارے سائنس دانوں نے بدی کی گولیاں بھی دریافت کر لی ہیں ــــ!

بدی کی گولیاں ــــ؟" میں نے حیرت سے پوچھا

"جی ہاں" وہ مسکرا کر بولا

پھر اُس نے اپنے حلق میں انگلی ڈال کر بائیں گال کی جانب سے ربڑ کی دوسری تھیلی برآمد کی۔ اُس کا زیپ کھول کر اس میں سے دوسری گولیاں مجھے دکھائیں۔

ان گولیوں کو کھانے سے آپ پر نیکی کی کسی گولی کا اثر نہیں ہو سکتا۔" وہ بڑے فخر سے بولا۔

"بہت خوب،" میں نے تضحیک سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا؛ مگر پھر نیکی کی گولیاں کھانے سے کیا فائدہ ــ؟"

وہ بولا۔" خود بدی کی گولی کھایئے۔ دوسروں کو نیکی کی گولی کھانے کی تلقین کیجئے۔ اس سے بزنس میں ہمیشہ فائدہ ہو گا ــــ کتنے پیکٹ دوں ــ؟

سیکنڈ ہینڈ کار!

مجھے شروع ہی سے سیکنڈ ہینڈ چیزوں کا شوق رہا ہے۔ بچپن میں اُستاد جو سبق پڑھاتے تھے وہ میں خود سے نہ لکھتا تھا بلکہ کسی ہم جماعت کی کاپی سے نقل کرلیا کرتا تھا۔ گھر سے اسکول کی نئی کتابوں کے لئے جو پیسے ملتے تھے ان سے نئی کے بجائے سیکنڈ ہینڈ کتابیں خرید لیتا تھا، حد یہ ہے کہ ان دنوں میرے دوست بھی سیکنڈ ہینڈ ہوتے تھے۔ یعنی کسی سے تعارف

کرا دیا تو دوستی ہو گئی - خود سے کسی کو دوست بنانے کی کبھی جرأت نہ ہوئی - دراصل میری جو یہ شامت آئی ہے - تو بچپن سے چلی آرہی ہے - اور اب تک چلی آرہی ہے -

اب اس کا کیا کیجئے کہ بڑے ہو کر بچپن کی یہی عادتیں اس قدر پختہ ہو جاتی ہیں کہ عادت ثانیہ بن جاتی ہیں اور پھر انسان کو اپنی خامیوں میں مزا آنے لگتا ہے - شامت کی سب سے بڑی علامت یہی ہے اب مجھے دیکھئے جو لطف مجھے کسی پُرانی سیکنڈ ہینڈ کتاب سے ملتا ہے وہ کسی نئی کتاب سے حاصل نہیں ہوتا - ایک تو سیکنڈ ہینڈ کتاب خریدنے میں کس قدر تردد کرنا پڑتا ہے - گھنٹوں کباڑیئے کے کوڑے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیے - پھر جب مایوس ہو کر کتابوں کے ڈھیر میں سے یونہی آپ ایک کتاب اُٹھا لیتے ہیں تو جلد غائب مصنف کے نام کا صفحہ پھٹا ہوا - آپ بڑی بے دلی سے صفحے اُلٹتے ہیں - یکایک آپ کی نگاہ رک جاتی ہے اور آپ دفعتاً چونک اُٹھتے ہیں - ارے یہ تو وہی کلاسک ہے جسے میں عرصہ سے ڈھونڈھ رہا تھا - آپ اپنی خوشی کو چھپاتے ہیں تاکہ کباڑیا آپ کی مسرت کو دیکھ کر زیادہ دام نہ مانگ لے - اس کے بعد کباڑیئے سے جو بھاؤ تاؤ شروع ہوتا ہے، وہ لطف بھلا کسی نئی کتاب بیچنے والے سکے ہاں کہاں ملے گا - وہاں تو دام مقرر، مصنف کا

نام معلوم گرد پوش صحیح سلامت ، ہر چیز اس قدر نپی تلی اصولوں کی پابند کہ آپ کتاب نہیں خرید رہے ہیں جیو میٹری کا سوال حل کر رہے ہیں چنانچہ اب تو یہ عادت اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ کتاب سے کار تک ہر چیز میں سیکنڈ ہینڈ خریدنے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں اور جب سیکنڈ ہینڈ نہ ملے تو نئی لیتا ہوں اور اپنی اس عادت کی وجہ سے مستقل شامت میں گرفتار رہتا ہوں۔

گزشتہ دنوں مجھے ایک گاڑی کی ضرورت تھی ، نئی موٹروں کے بہت سے ماڈل ایسا کہ کلیجے سے لگا لینے کے قابل ، ایک گاڑی دیکھی جو دن میں ڈائیننگ روم اور رات میں بیڈ روم کا کام دے سکتی تھی ۔ ایک گاڑی میں دو انجن لگے ہوئے دیکھے ایک فیل ہو جائے تو دوسرا کام کرنے لگے ایک گاڑی دیکھی جس کا سارا جسم پلاسٹک کا بنا ہوا تھا سنا ہے اگلے سال نائی لان کی بنی ہوئی گاڑیاں آئیں گی جنھیں انجن سے الگ کر کے لانڈری میں دھلنے کے لئے دیا جا سکے گا۔

موٹر بیچنے والوں کے ہاں میری بڑی آؤ بھگت ہوئی ان دنوں موٹر کا دلال بھی خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا ، ہر جگہ موٹر بیچنے والے شربت آئس کریم چائے ، پان ، سگریٹ سے تواضع کرتے تھے ، بہت سے بے وقوف جنھیں میری مالی حالت کا پتہ نہ تھا ، مجھے نئی موٹر قسطوں

پر دینے کو تیار تھے مگر میں نے ہامی نہ بھری، ڈیڑھ دو ماہ کے چکر لگانے کے بعد ایک روز موٹروں کے دلّال نے مجھ سے کہا، آخر آپ کس طرح کی موٹر چاہتے ہیں۔ میں نے کہا سنو۔ میں ایک کپ چائے پی لوں تو دن بھر کام کرتا رہتا ہوں ایسی ہی میں موٹر بھی چاہتا ہوں جس میں ایک گیلن پٹرول ڈالوں تو دن بھر چلتی رہے۔ میرا زملک روپ تم نے دیکھا ہے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ اسے دیکھ کر لوگ چونک پڑیں۔ بس۔ میری موٹر کا رنگ بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے جسے دیکھ کر کسی فلم کی ہیروئن کا خیال نہ آئے بلکہ اگر خیال آئے تو یہ آئے آہ دنیا فانی ہے اور کیا انسان کی زندگانی ہے۔ ایک لمحہ میں بلبلہ ہے دوسرے لمحہ میں پانی ہے۔ موٹر کا دلّال بولا، بس میں سمجھ گیا آپ ایک سیکنڈ ہینڈ کار خریدنا چاہتے ہیں۔

دو ماہ کی تلاش بسیار کے بعد ہم نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار خرید لی۔ جیتے صاحب اگر آپ اس وقت یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہاں میں سب کے سامنے اپنی گاڑی کی خامیاں بیان کروں گا تو آپ سب غلطی پر ہیں۔ خامیاں کس میں نہیں ہوتیں۔ کون انسان یا کون سی گاڑی ایسی ہے جو خامیوں سے پاک ہے۔ میری سیکنڈ ہینڈ گاڑی میں ہزار چھوٹے بڑے نقص ہوں گے۔ مگر صاحب چلتی ہے اور چلتی کا نام گاڑی ہے۔

میری گاڑی کا رنگ ملگجا اُودا ہے، انجن اور مڈ گارڈوں پر ملگجا ہے

اور درمیان کی باڈی پر اودا ملگجا ہے۔ اور آخر میں جہاں سامان رکھا جاتا ہے وہاں بالکل ملگجا ہے بلکہ سیاہی مائل ہے بلکہ کبھی کبھی جب سڑک پر گزرتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں یہ گاڑی چمک اٹھتی ہے۔ حالانکہ اس میں سورج کی کرنوں کو کافی محنت کرنی پڑتی ہوگی، پھر بھی صاحب جب کبھی یہ چمک اٹھتی ہے تو ایک رنگ کے بجائے کئی رنگ آنکھوں میں نکھر جاتے ہیں، شاید میری گاڑی نے اپنی مختصر سی زندگی میں ہر رنگ دیکھا ہے۔ یہ وہ شمع ہے جو ہر رنگ میں جلتی ہے بلکہ جلتی ہے۔

میری گاڑی کی سیٹوں میں اسپرنگ نہیں ہیں، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس گاڑی کے پچھلے مالک کے دماغ میں جتنا بھوسہ تھا وہ سب اس نے اٹھا کر اس گاڑی کی سیٹوں میں بھر دیا ہے۔ مگر صاحب اس بھوسہ کے اوپر چمڑے کی جو سیٹیں ہیں وہ بہت عمدہ ہیں اور کسی خوشامدی کی کھال کی طرح چکنی اور دبیز ہیں۔

میری گاڑی میں اسپرنگ نہیں۔ تو کیا ہوا بریک بھی تو نہیں ہیں حالانکہ سنتے ہیں کہ گاڑی میں بریکوں کا ہونا ضروری ہے مگر ہم نے تو آج تک ان کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہماری گاڑی بریک ہوتی رہتی ہے کیونکہ اس میں بریک نہیں ہیں۔ مگر صاحب ہمیں کبھی ان بریکوں کی حاجت نہیں ہوئی۔ یہ گاڑی سڑک پر اس طرح

اٹھلاتی ہوئی چلتی ہے کہ آپ بڑے اطمینان سے گاڑی سے اُتر کر نکڑ کی دکان سے پان کھا کر پھر اس گاڑی پر بیٹھ سکتے ہیں کسی پہاڑی ٹرین کی طرح۔

جس دن سے میں نے اس گاڑی کو خریدا ہے ایک نہ ایک مصیبت میری جان کو لگی رہتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ ہوا کہ میری گاڑی کو بمبئی کی سڑکوں پر گھومتا دیکھ کر میرے نام ایک نوٹس آیا محکمۂ آثار قدیمہ کی طرف سے۔

"وجہ بیان کرو کہ یہ گاڑی تمہارے پاس کیوں ہے اور کیوں نہ اسے ہمارے محکمہ کی تحویل میں دے دیا جائے۔" بڑی مشکل سے میں نے محکمۂ آثار قدیمہ والوں سے پنڈ چھڑایا کہ عجائب گھر والوں نے اُدھم مارا۔ ان کا اصرار تھا کہ یہ گاڑی ضرور کسی عجائب گھر سے چرائی ہوئی ہے۔ آخر بڑی مشکل سے میں نے انہیں بھی قائل کیا کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

میں اس گاڑی کی تاریخی عظمت سے انکار نہیں کرتا لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ جونہی میں اسے کسی بازار میں روک کر کھڑا کرتا ہوں اور خود کسی دکان میں گھس جاتا ہوں اور سودا لے کر واپس آتا ہوں تو چند منٹوں ہی میں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ اسے دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔

مجھے بے حد غصہ آتا ہے۔ ایسا بھی کیا میں کوئی گرا پڑا غیر معروف آدمی نہیں ہوں مگر لوگ مجھے دیکھتے ہیں اور بڑی حیرت سے دیکھتے ہیں، کوئی اسے ویل مچھلی کا بچہ بتاتا ہے کوئی اسے ٹرام کی بیٹی سمجھتا ہے۔ اکثر لوگوں کی تو

سمجھ ہی میں نہیں آتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے۔

ایک بار کیا ہوا میں چوپاٹی سے گزر رہا تھا، اس دن چوپاٹی پر کسی مشہور لیڈر کا بھاشن تھا۔ میں چوپاٹی کے قریب گاڑی روک کر دہی بڑے کی چاٹ کھانے لگا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ایک کرکے لوگ لیڈر کے جلسہ سے اُٹھ کر چلے آرہے ہیں اور میری گاڑی کے گرد کھڑے ہوتے جارہے ہیں تھوڑی دیر میں سارا مجمع میری گاڑی کے گرد آگیا اور وہ مشہور لیڈر چوپاٹی کے ساحل پر اکیلا کھڑا رہ گیا۔

دوسرے دن اس لیڈر نے مجھ پر ہرجانے کا اور ہتک عزت کا دعویٰ دائر کر دیا کیونکہ میں نے اس کے جلسہ کو درہم برہم کر دیا تھا اور اس کی سیاسی شہرت کو چوٹ پہنچائی تھی۔ بہت بڑا سالسٹر کا نوٹس تھا۔

بڑی مشکل سے میں نے معافی نامہ دے کر جان بچائی اور اس دن سے قسم کھائی کہ جس دن کسی بڑے لیڈر کا جلوس ہمارے شہر میں سے گزرے گا میں کبھی نہ اپنی گاڑی سڑک پر نکالوں گا، خواہ مخواہ کسی کی روزی پر لات مارنے سے کیا فائدہ؟

اس گاڑی کی ایک مصیبت یہ بھی تو ہے کہ اس کے پرزے کبھی نہیں گھستے اور اگر گھستے ہیں تو پھر ملتے نہیں۔ پہلے انگلینڈ میں ملتے تھے اب وہاں بھی نہیں ملتے، اب تو دنیا کے کسی ملک میں نہیں ملتے۔ جانے کب کی یہ گاڑی

ہے۔ اتنے برسوں میں ملکوں اور قوموں کا ڈھانچہ ہی بدل گیا مگر ہماری گاڑی کا سانچہ نہیں بدلا۔ اب تو میں نکڑ کے لوہار سے خاص طور پر لوہا گلا کر اس کے پرزے ہاتھ سے بنواتا ہوں۔

اس گاڑی کی ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ جہاں اس نے کسی بس سٹاپ کے کیو میں کسی خوبصورت لڑکی کو کھڑے ہوئے دیکھا بس وہیں رک جاتی ہے اب میں اسے لاکھ آگے چلاتا ہوں اسٹیرنگ کرتا ہوں، چابی گھماتا ہوں، ریس کرتا ہوں، ہینڈل مارتا ہوں، مگر کیا مجال صاحب جو یہ گاڑی اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہٹے۔ لیکن جہاں آپ نے اس خوبصورت لڑکی کو لفٹ دی، بس گاڑی خود بخود چلنے لگے گی۔ ساری دنیا جانتی ہو کہ میں انتہائی شریف انسان ہوں۔ مگر اس گاڑی کو کیا کہیے جو اس قدر حسن پرست واقع ہوئی ہے کبھی اس کانپتی ہوئی رعشہ زدہ گاڑی کی بڈھی آنکھوں یعنی ہیڈ لائٹس کو دیکھ کر مجھے غالب کا وہ شعر یاد آجاتا ہے سے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

اس گاڑی کی اور تو سب مصیبتیں خیر میں برداشت کر بھی لوں اور کر بھی لیتا ہوں لیکن اس گاڑی کی سب سے بڑی شامت اس کے پچھلے مالک ہیں۔ ایک بار میں ایک دوست کے بنگلے پر اس سے ملنے کے لئے

گیا۔ چند منٹ کا کام تھا فوراً واپس آگیا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک گداگر مسکین صورت پھٹے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک عجیب انداز سے میری گاڑی کی طرف دیکھ رہا ہے
میں نے پوچھا، کیا بات ہے بھائی ؟

وہ گداگر میری طرف عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ پھر رک کر رونے لگا۔ میں نے اس گداگر سے کہا "اے پیر نیک صورت تو پہلے ہنسا کیوں؟ پھر رویا کیوں ؟ یہ قصّہ کیا ہے ؟

اس گداگر نے زور سے ایک آہ بھری اور بولا :۔ ایک زمانہ وہ تھا جب میں اس گاڑی کا مالک تھا۔ وہ زمانہ یاد کرکے میں ہنسا۔

"اور روئے کیوں ؟" میں نے پوچھا۔

"رویا اس لئے" وہ گداگر بولا "کہ جس طرح میرے پاس یہ گاڑی نہ رہی ایک دن تمہارے پاس بھی نہ رہے گی"!

میں نے گداگر کو دونی دی اور گاڑی لے کے آگے بڑھ گیا۔

ایک بار ایک صاحب ریلوے اسٹیشن کے باہر مجھے مل گئے اور بولے۔ میں اس گاڑی کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا وارنٹ دکھلائیے۔ بولے وارنٹ تو نہیں ہے میرے پاس لیکن یہ جان لیجئے کہ آج سے پچاس سال پہلے میں اس گاڑی کی سیٹ پر ایک روپیہ رکھ کر بھول گیا تھا۔ بعد میں میں نے یہ گاڑی بیچ دی۔ مگر اس وقت مجھے اس روپیے کا خیال نہ رہا۔ جب اس کا

بنیا مالک اسے لے کر چلا گیا۔ بعد میں میں نے کئی بار اسے ڈھونڈھنے کی کوشش کی مگر یہ گاڑی اپنے مالک بدلتی رہی اور میں بھی بمبئی سے باہر چلا گیا تھا۔ آج آیا ہوں۔ غریب و نادار مسافر ہوں۔ گاڑی کی تلاشی دے دیجئے اگر میرا روپیہ مل گیا تو آپ کی جان و مال کو دعا دوں گا۔

میں کیا کرتا بھائی اب اجازت دینا پڑی۔ اس آدمی نے چمڑے کی سیٹیں کھول کر سارا بھوسہ چھان مارا۔ کئی صدیوں کی باس تھی اس بھوسے میں۔ کہاں اب وہ بھوسہ رہا تھا؟ جس طرح چٹانوں میں لاکھوں سال دبے رہنے سے عالم نباتات کے پودے کوئلے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سیٹوں کا بھوسہ بھی کیمیائی عمل میں کوئلے کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ بہت سا بھوسہ چھاننے کے بعد اس آدمی کو اپنا روپیہ مل ہی گیا۔ چلا کر بولا۔ یہ دیکھو میرا روپیہ حلال کا روپیہ تھا اس لئے مل گیا

اس دن سے میں سوچ رہا ہوں کہ ایک روز اس گاڑی کو سر سے پاؤں تک کھول کر دیکھوں، ممکن ہے کسی منچلے نے اس کے اندر کوئی دفینہ چھپا رکھا ہو۔"

مگر دفینہ ڈھونڈھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ہوا یہ کہ ایک روز جب میں گھر سے دفتر جانے کے لئے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دو آدمی بڑے مزے سے اس گاڑی سے لگ کر اس آدم سے باتیں کر رہے ہیں

جیسے ان کے باوا کی گاڑی ہو۔ ایک صاحب جو لانبے تھے دوسرے سے جو چھوٹے قد کے تھے کہہ رہے تھے "تمہیں یاد ہے بھئی؟ یہ گاڑی ہمارے باوا کی تھی؟ یاد ہے اس گاڑی میں تمہارے چاد بڑے بھائی بیمار ہو کر ہسپتال گئے تھے اور مرنے کے بعد اسی گاڑی میں واپس لائے گئے تھے۔"

لانبا آدمی بولا "میرے باپ نے تمہارے باپ سے یہ گاڑی خریدی تھی۔ مگر دس مہینے ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔" اس کے بعد اس گاڑی کو ول سکھ بھائی نے خریدا تھا لیکن خریدنے کے آٹھ ماہ بعد ان کا دیوالیہ نکل گیا۔

"عجیب منحوس گاڑی ہے یار پر اپن کو کیا اپنے پاس اب تھوڑی ہے"

وہ تو یہ گفتگو کر کے چلے گئے۔ میں تھر تھر کانپنے لگا میں اس وقت اس گاڑی کو لے کر مارو بے نیچ پر پہونچ گیا اور اسے دھکا دے کر کھڈ کے نیچے گرا کر چلا آیا۔ گھر آ کر بڑے اطمینان کا سانس لیا۔ خس کم جہاں پاک۔!

مگر دوسرے ہی دن ایک خطرناک بھونپوں کی آواز سنائی دی۔ باہر جا کے کیا دیکھتا ہوں کہ وہ برقی پرانی گاڑی صحیح سلامت حالت میں دروازے کے باہر کھڑی ہے اور ٹکڑ کا مستری خوشی سے چلا کر کہہ رہا ہے۔ تمہاری گاڑی مارو بے کے کھڈ میں مجھے مل گئی۔

میں اسے چلا کر یہاں لایا ہوں۔" میں نے پوچھا "کھڈ میں گر کر بھی نہیں ٹوٹی؟"

ارے نہیں بھائی۔ بالکل ٹھیک ہے۔ چاہو تو چلا کر ابھی دیکھ لو۔ ایک پُرزہ کہیں سے نہیں ملا۔"

یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے۔ میں تو اس گاڑی کو چھوڑتا ہوں مگر یہ گاڑی مجھے نہیں چھوڑتی! — ؟

○

میٹھے انار

وہ اس دنیا میں میرا سب سے اچھا دوست تھا۔ اس کا جسم دُبلا
پتلا تھا۔ قد چھوٹا رنگ سیاہ گال پچکے ہوئے ہونٹ بے حد سیاہ
لیکن جب وہ ہنستا تھا تو اس کے سارے چہرے کا رنگ بدل جاتا
تھا اس کی گول گول سیاہ بٹن ایسی آنکھوں میں دلیری اور شرارت کی
چمک آجاتی تھی۔ وہ اس کی تیز ہنسی کا فوارہ یوں پے در پے قہقہوں

میں پھوٹتا تھا جیسے دیوالی کی سیاہ رات میں آسمان کے پس منظر میں ایک آتشیں انار فضا میں بلند ہو جائے اس کا نام منّو تھا وہ ہمارے باغ کے مالی کا لڑکا تھا اس کی عمر مشکل چھ سات برس کی ہو گی ۔ اتنی ہی میری عمر ہو گی ۔

ہمارا باغ نہایت ہی خوبصورت تھا اس میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے فوارے تھے ۔ پھولوں کے قطعے تھے اونچی اونچی گھاٹیاں تھیں ڈھلوانیں تھیں ایک چھوٹا سا تالاب تھا اس پہ ایک منا سا پل تھا جس پر غروب آفتاب کے وقت میری بڑی بہن اور اس کا شوہر آتے تھے اور اس پل پہ کھڑے ہو کر ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے الّوؤں کی طرح ڈوبتے ہوئے سورج کو چپ چاپ دیکھا کرتے اور منہ سے کچھ نہ کہتے ۔ جانے یہ بڑی عمر کے لوگ ڈوبتے ہوئے سورج میں کیا دیکھتے ہیں ! میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا ۔

ہمارے باغ میں کشمیری سیب تھے اور فرنچ ایپل اور کوکے کے کھٹے میٹھے سیب ، سنہری خوبانیوں کے پیڑ تھے اور ہری ہری جلد والے بلم جو جب پک جائے تو جگہ جگہ سے اودے ہو جاتے ہیں ۔ اور ان کی جلد میں دانت گاڑ دو تو ان میں سے لہو کی طرح کا سرخ رس نکلتا تھا وہاں پہ بگو شے تھے اور ناخ اور ٹینگ ، الوچے ، آلو بخارے ، شفتالو ،

چیری اور شہتوت اور جب بہار آئی تو اتنے رنگوں کے پھول لے کر آتی اتنے پرندوں کی چہکاریں لے کر آتی۔ اتنی بھنوروں، شہد کی مکھیوں اور رنگین تتلیوں کی اڑانیں لے کر آتی کہ ان سب کے پیچھے بھاگنا مشکل ہوتا تھا۔ بڑا ہی خوبصورت باغ تھا۔ دنیا کا وہ کونسا درخت تھا جو ہمارے باغ میں نہیں تھا۔

بس ایک کمی تھی تو ہمارے باغ میں انار کا پیڑ نہیں تھا۔ چھوٹی چھوٹی کھٹی اناریوں کے تو بہت سے پیڑ تھے لیکن میٹھے انار کا ایک بھی پیڑ نہیں تھا اور جتنے میٹھے انار تھے۔ سب راجہ جی کے باغ میں تھے۔ دنیا کے کسی باغ میں نہ تھے تو اور کہاں ہوں گے؟

نہر میں نہاتے نہاتے جو اوپر کے پہاڑی چشموں سے آتی تھی اور شہر کے لئے پانی پینے کے لئے لائی گئی تھی اور راجہ جی کے باغ سے گذرتی تھی۔ جب میں اور منو راجہ جی کے خاردار اور آہنی جنگلوں کے پیچھے میٹھے اناروں کو درختوں سے لٹکتے ہوئے دیکھتے تو ہمارے منہ میں پانی بھر آتا کیسے پیارے پیارے انار تھے وہ! جلد کیسی صاف شفاف۔ ہلکی ہلکی اور اہٹ اپنے رخساروں پر لئے ہوئے وہ انار کس طرح فضا میں جھولتے اور ہنستے دکھائی دیتے تھے

پہلے تو انار کی شاخوں پر موہنہ بند کلیاں پھوٹتی تھیں۔ پھر انہی کلیوں میں شہابی رنگ کے پھول کھلتے تھے۔ پھر ان پھولوں کے ڈھلنے سے چھوٹے

چھوٹے چوکور انار پیدا ہوتے تھے۔ اور بڑھتے بڑھتے شہد کی ڈبیوں کی طرح لٹکنے لگتے تھے۔ پھر ایک دن شاخیں خالی ہو جاتی تھیں اور ہمیں معلوم ہو جاتا تھا کہ جتنے میٹھے انار تھے سب راجہ جی کے محل میں پہنچ گئے۔ نہر میں تیرتے تیرتے اور منو خالی درختوں کو بڑی حسرت سے دیکھا کرتے۔ کیا ہماری قسمت میں میٹھے انار کبھی نہ آئیں گے۔

ایک روز جب میٹھے اناروں کا جوبن عین شباب پر تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے نہر میں تیرتے تیرتے پانی کی کلیاں منو پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "چلو، راجہ جی کے باغ میں چلیں اور میٹھے انار توڑ لائیں۔"

منو ڈر گیا۔ بولا "راجہ جی ماریں گے۔"

"راجہ جی کہاں ہیں بدھو۔ وہ تو اپنے محل میں ہیں۔"

"تو مالی ہوگا۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ راجہ جی کے باغ کا مالی کتنا ظالم ہے، میرا باپ کہتا ہے ...." میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "اس تپتی دوپہر میں مالی بھی کہاں ہوگا۔ سو رہا ہوگا........ مجھے تو کہیں نظر نہیں آتا۔"

"کسی جھاڑی کے پیچھے چھپا بیٹھا ہوگا۔ چنو!" منو نے نہایت رازداری میں کہا۔ "تم نہیں جانتے کبھی مالی ایسا کرتا ہے۔ میرا باپ بھی اسی طرح گھات لگائے بیٹھا ہے۔ اپنے باغ میں جب باہر کے لڑکے باغ میں چھپا

مارنے کی کوشش کرتے ہیں میں سب جانتا ہوں" اس نے بڑی دانشمندی
سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔۔۔۔"

میں نہر سے نکل کر سنار دار آہنی جنگلے کے قریب آ گیا اور بولا منو
تم بڑے بزدل ہو اندر جانے سے ڈرتے ہو۔

منوا چک کر کنارے پہ آ رہا۔۔۔۔۔ وہ اپنی لنگوٹی کستے ہوئے بولا
"ڈرتا ہے؟ میں کہ تم؟ اندر چل کر دیکھو"

اتنا کہہ کر وہ دو تاروں کو اوپر نیچے کر کے باغ میں کود گیا اس کے پیچھے
میں کودا جلدی جلدی ہرن کی طرح قلانچیں بھرتے ہوئے ہم دونوں ایک ہی
پیڑ پہ چڑھ گئے۔

لیکن پہلا انار ہم نے جھولی میں نہیں ڈالا۔ اسے توڑ کر فوراً دانت سے
کاٹا۔ میٹھے دانوں کا شہد اور اس کی جلد کا کڑوا ذائقہ ۔۔۔ دونوں ذائقے
ایک ہی لمحہ ہماری زبان پہ آئے لیکن برسوں کی حسرت نے کڑواہٹ کا
ذائقہ بھلا دیا۔ ہونٹوں پہ اناروں کی شہد آ گئیں۔ مٹھاس باقی رہ گئی۔

میں نے چٹخارے لیتے ہوئے کہا۔ "ہونہہ کتنا میٹھا ہے!"

اس کے بعد پیڑوں کی ڈالیاں یکے بعد دیگرے ہلنے لگیں ہم نے اتنے
انار توڑ لئے، جتنے ہماری جھولی میں بھی نہ آ سکتے تھے۔ بڑی مشکل سے اور
بڑی حسرت سے ان اناروں کو تکتے ہوئے ہم پیڑ سے اترے ابھی کتنے

ہی انار باقی درخت پر رہ گئے تھے۔ اور ابھی سارا باغ ان اناروں سے بھرا پڑا تھا کاش کہ ہماری جھولی اتنی بڑی ہوتی جتنا ہمارا دل تھا۔

"چلو اب بھاگ چلیں!" میں نے صلاح دی۔

منو کی للچائی ہوئی نظریں دوسرے پیڑ پر پڑیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "چنو! دیکھو اس پیڑ کے انار کتنے بڑے بڑے اور سرخ ہیں!"

"مالی آ جائے گا!"

"مالی کی ایسی کی تیسی" منو اب بڑی جی داری سے بولا۔

"راجہ جی آ جائیں گے" میں نے پھر ڈرایا۔

جواب میں منو نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔ منو کے لبوں کو خون لگ چکا تھا۔ اب وہ کس راجہ کی پرواہ کرتا ہے۔

منوہر نے کہا "ہم ان اناروں کو اس جھاڑی کے نیچے چھپا دیں گے اور اس پیڑ پر چڑھ کر بڑے بڑے انار توڑیں گے۔"

ہم دونوں نیلا دھاری کے پیچھے جا کر اپنی اپنی جھولی کی گانٹھیں کھول کر انار نیچے گرانے ہی والے تھے کہ ایک زبردست ہاتھ منو کی گردن پر پڑا۔ اور ایک میری پیٹھ پر اور کسی نے زور سے گھما کر اپنی مضبوط ٹانگوں سے جکڑ لیا تھا......"

ایک دیوہیکل مالی ہمارے سر پہ کھڑا تھا اور ہم اس کی ٹانگوں میں جکڑے

ہوئے تھے اور ہماری جھولیاں اناروں سے بھرپور تھیں۔

میں اور منو رونے لگے۔ خاردار جنگلے کے باہر کیسی خوب صورت نہر تھی اور اس کا نیلا چمکتا ہوا پانی ترل مل ترل مل کرتا ہوا کسی بیگانہ آزادی سے بہہ رہا تھا۔

مالی نے ہم دونوں کو لے جا کر راجہ جی کی حوالات میں بند کرا دیا۔

سارے شہر میں آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی۔

راجہ جی کے باغ میں چور گھس آئے تھے۔ انہوں نے راجہ جی کے میٹھے انار توڑ لئے تھے۔ صدیوں سے یہ کسی کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ راجہ کے میٹھے اناروں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے حسرت ہر ایک کے دل میں تھی مگر ہمت کسی دل میں نہ تھی ایک دم یہ کیسے ہو گیا۔

لوگ متعجب تھے اور جوق در جوق ہمیں دیکھنے کے لئے آنے لگے تھے اور ہمیں دیکھ کر حیرت کا اظہار کرنے لگے۔

دو چھوٹے چھوٹے بچے، ننگ دھڑنگ بچے، ایک لنگوٹی پہنے ہوئے اور دوسرا خاکی نکر پہنے ہوئے۔ یہ نحیف اور کمزور بچے انہوں نے میٹھے انار پر ہاتھ ڈالا۔

ایک گھنٹہ گذر گیا، دو گھنٹے گذر گئے، تین گھنٹے گذر گئے۔ جب سہ پہر جانے لگی تو حوالات کا آہنی دروازہ شور مچاتے ہوئے کھلا اور

میرے والد میری روتی ہوئی والدہ کو لے کر حوالات میں داخل ہوئے،
میری والدہ نے لپک کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور سسک سسک
کر رونے لگی اور میرا منہ چومنے لگیں میں بھی رونے لگا اور تو بھی بد
میرے والد نے میری انگلی پکڑی۔ اور بولے چلو بیٹا گھر چلو!"
میں اپنے والد کے ساتھ ہولے ہولے چلنے لگا۔
"یکایک منو دوڑتا ہوا آیا اور میرے باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گیا
"چاچا!" مجھے بھی لے چلو۔ چاچا جی!"
میرے باپ نے پلٹ کر منو کو ایک لات جمائی۔
منو دھڑام سے حوالات کے سخت فرش پر جا گرا۔ اور پھر اٹھا اب
میری ماں نے اسے زور سے طمانچہ رسید کیا اور بولی۔"
بدمعاش! ہمارے بچے کی عادت بگاڑتا ہے۔ اسے بری بری باتیں
سکھاتا ہے!"
"میں نے تمہیں اسی دن کے لئے کہا تھا۔ میرے والد مری ماں سے
تہدیدی انداز میں کہنے لگے۔
اپنے بچے کو بری صحبت سے بچائے رکھ انہیں ان کمینوں کے ساتھ
نہ کھیلنے دے۔ مگر تو کہاں میری بات پر غور کرتی ہے۔
تھانے دار بولا "ڈاکٹر صاحب! آپ راجہ جی کا علاج کرتے ہیں

اس لئے آپ کے بچے کو چھوڑ دیا ورنہ آپ یہ جانتے ہیں کہ راجہ جی کے باغ میں چڑیا تک بھی پر نہیں مار سکتی ......

"میں جانتا ہوں! میں جانتا ہوں!!" میرے والد بڑی بے بسی سے بولے "آپ کی بڑی مہربانی ہے تھانے دار صاحب آئندہ میں خود خیال رکھوں گا!"

میرے والد مجھے لے کر چلے آئے، حوالات کا آہنی دروازہ منو پر بند ہو گیا۔

شام ڈھلے منو بھی واپس آ گیا۔ مالی کی تو ہمت نہ پڑی تھی لیکن منو کی ماں اپنے چاندی کے کڑے گروی رکھ کر دس روپے لے کر تھانے دار کے پاس گئی اور اس سے اپنا لڑکا چھڑا کر لے آئی۔

جب نے منو کو دیکھا تو وہ اس وقت اپنے جھونپڑے سے کچھ دور حیران و پریشان گلاب کی جھاڑی کے پاس کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔

میں خوشی سے بھاگتا ہوا اس کے پاس آ گیا اور اس سے کہا۔ ...

آؤ منو کھیلیں!"

منو چپ رہا

میں نے بڑی لجاجت سے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور اس سے کہا۔ کیوں منو۔ میرے ساتھ کیوں نہیں کھیلو گے؟ کیا تم میرے دوست

نہیں ہو۔۔؟"

"نہیں جینو! تم ڈاکٹر کے لڑکے ہو۔ اور میں مالی کا لڑکا۔ میری تمہاری دوستی کیا؟"

اتنا کہہ کر وہ روتا ہوا مڑا اور اپنے جھونپڑے کے اندر چلا گیا۔

O

پھانسی کے سائے میں

زندگی کے آخری لمحے بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ محض جینا ہی کافی ہے۔ محض جینا ہی خوبصورتی ہے ...... مجھے فیروز ڈاکو کے آخری لمحے یاد آتے ہیں۔ ان دنوں میں کالج میں پڑھتا تھا اور گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک دوست کے ہاں رام گڑھ جا رہا تھا۔ تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بہت بھیڑ تھی بڑی مشکل سے مجھے کھڑے ہونے کی جگہ ملی۔ لمبا سفر تھا

کئی گھنٹے اسی طرح کھڑے کھڑے گزر گئے۔ میرے قریب کی بنچ پر دو ننھی ننھی لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ اور ان کے ساتھ ان کا بھائی جس کی عمر بمشکل آٹھ نو سال کی ہو گی۔ ان سے پرے ان کی ماں بیٹھی تھی، اس سے پرے پھر دو لڑکے بیٹھے تھے۔ ان کے کپڑے صاف تھے اور سر پر چھوٹی چھوٹی ململ کی ٹوپیاں ان کے ساتھ ان کی ماں بیٹھی تھی ادھیڑ عمر کی لالائن جس نے ایک میلے رنگ کی ریشمی دھوتی پہن رکھی تھی اس کا گول چہرہ متین اور غمگین نظر آتا تھا۔ دونوں لڑکے سمٹ کر الگ بیٹھے تھے اور کبھی کبھی ان دو ننھی ننھی لڑکیوں کی ماں کو دیکھ لیتے۔ ان کے چہروں پر غم و غصہ اور خوف کے جذبات ہویدا ہو جاتے اور پھر وہ اپنا چہرہ پرے کر لیتے۔ اور اپنی ماں کا آنچل پکڑ لیتے۔ ننھی لڑکیوں کی ماں کا چہرہ فق تھا اور بار بار اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے اور وہ انہیں کالے رنگ کے کھدر کے دوپٹے سے پونچھ لیتی۔ اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی اس کا لڑکا اپنی ننھی بہنوں کو میٹھے نوساد اور کھٹے کچالو اور گنڈیریاں راستے کے مختلف اسٹیشنوں سے خرید کر کھلاتا تھا اور لالائن کے لڑکے اسے گھور کر دیکھتے اور پھر اپنی ماں سے کسی چیز کی فرمائش کرتے اور پھر لالائن آہستہ سے جھک کر سیٹ کے نیچے سے ایک ٹوکری کا ڈھکنا الگ کر کے سیب یا سنگترے یا کیلے نکال کر اپنے بیٹوں کو دیتی اور وہ ایک فاتحانہ انداز سے ان دونوں لڑکیوں کے

بھائی کی طرف دیکھتے اور مزے سے پھل اسے دکھا دکھا کر کھانے میں مصروف ہو جاتے۔

ابھی رام گڑھ بہت دور تھا اور میں کھڑا کھڑا تھک گیا تھا اس لئے میں نے اپنے قریب کے بنچ پر بیٹھی ہوئی ننھی لڑکی سے التفات ظاہر کیا اسے ایک دو اسٹیشنوں سے کھانے کے لئے چیزیں بھی خرید کر پیش کیں۔ بڑی پیاری ننھی سی لڑکی تھی وہ بہت جلد میری گود میں آگئی اور میں آرام سے اس کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اس نے میری ناک سے کھیلتے ہوئے کہا "تم کدھر جا رہے ہو"

میں نے کہا "میں رام گڑھ جا رہا ہوں۔"

ننھی نے اپنی ماں سے مخاطب ہو کر کہا "اماں یہ رام گڑھ جا رہا ہے"

ننھی کی ماں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ قریب بیٹھی ہولالائن اور اس کے دونوں لڑکوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر کسی نے مجھ میں دلچسپی لینا مناسب نہ سمجھا۔ صرف میری گود میں بیٹھی ہوئی لڑکی ہی مجھے حیرت کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ حیرت اور خوشی میں اس کا ساتھی۔ ہم دونوں رام گڑھ جا رہے تھے۔

میں نے اس سے پوچھا "تمہارے ابا کا کیا نام ہے؟"

وہ بولی فیروز! "

میں نے پوچھا "تمہارے آبا رام گڑھ میں ہیں؟"

وہ بولی "ہاں میرے آبا ویل میں ہیں"

"ویل میں؟" میں نے پھر پوچھا۔ اس کی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اب دو چار اور لوگ بھی ہماری گفتگو میں دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔

"جیل، پھانسی؟"

یکایک جیسے سارے ڈبے میں سناٹا چھا گیا میں نے لڑکی کی اماں کی طرف دیکھا، لیکن اس نے اپنا چہرہ اپنے کالے دوپٹے میں چھپا لیا تھا اور سسکیاں لے رہی تھی اس ڈبے کی خاموشی میں وہی سسکیاں پھیلتی جا رہی تھی۔ لالائن نے اپنے دونوں بچوں کو اپنی چھاتی سے چپٹا لیا۔ سب لوگ خوفزدہ سے ہو گئے تھے۔ جیسے اس چلتی گاڑی میں کسی نے پھانسی کا تختہ ان کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ اور وہ اپنی گردن اسی رسّی میں دیکھ رہے تھے

"اماں۔ ابا کو پھانسی ہو گی نا!" لڑکی نے بڑے چاؤ سے اپنی اماں سے پوچھا۔ اماں نے فوراً اسے میری گود سے چھین لیا اور زور سے ایک طمانچہ رسید کیا اور پھر اسے اپنے کالے دوپٹے میں چھپا لیا۔ لڑکی بہت دیر تک اس کالے دوپٹہ میں روتی رہی۔ لالائن اور اس کے بیٹے اور پرے سرک گئے۔ فرش پر دو کسان بیٹھے تھے وہ بھی رام رام کرتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور دور ڈبے کے دوسرے کنارے پر جا کھڑے

ہوئے۔ اس عورت اور اس کی دو لڑکیوں اور اس کے لڑکے کے ارد گرد گاڑی کے مسافروں نے ایک نظر نہ آنے والی چار دیواری کھڑی کر دی اور پھر آہستہ آہستہ اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ صرف اس چار دیواری کے اندر فیروزہ اور اس کی بیوی اور اس کے بچے اکیلے رہ گئے تھے اور ایک اجنبی ایک طرف دروازے کی دہلیز پہ کھڑا تھا اور گاڑی چل رہی تھی

اس رات رام گڑھ سے دس میل باہر میرے ایک دوست نے ایک دعوت کا انتظام کیا۔ چاندنی رات تھی۔ لیکن چاند آدھے سے بھی کم تھا۔ اس لئے چاندنی میں سیاہی اور سیاہی میں چاندنی گھلی ہوئی تھی۔ ایسی رات عجیب پر اسرار ہوتی ہے، زندگی نامعلوم راستے پر دوڑنا چاہتی ہے اور اپنے عزیز ترین دوستوں کے چہرے بھی اجنبی معلوم ہوتے ہیں اس محفل رقص و سرود میں مجمع بھی عجیب تھا، عورتیں بھی اس دیس کی معلوم نہ ہوتی تھیں یہ ہنسی بھی فطری نہ تھی، نہ جانے غم کا ہلکا سا غبار مجھے فضا میں تیرتا ہوا کیوں معلوم ہوتا تھا۔

"میرے دوست نے پوچھا "تم چپ کیوں ہو؟"

"تھکا ہوا ہوں شاید؟"

"اس لڑکی کا رقص تمہیں پسند نہیں۔

"مجھے نیند آ رہی ہے"

میرا خیال ہے، میں وہیں اسی گاؤ تکیے سے سہارا لگائے سو گیا۔ سوتے وقت صرف اتنا یاد ہے کہ زبان پر شراب کا ہلکا میٹھا ہلکا تلخ ذائقہ باقی تھا، لڑکی ناچ رہی تھی۔ گھنگروؤں کی صدا میں اس کی جوان آواز پگھل پگھل کر کہہ رہی تھی۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا۔

میرے دوست نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔ موٹر بھاگی جا رہی تھی غالباً محفل رقص و سرود ختم ہو چکی تھی۔ اور ہم واپس رام گڑھ جا رہے تھے فضا میں ایک اجلا پن آ رہا تھا۔ اور بہت سے تاروں کے رنگ ماند پڑ گئے تھے لیکن دو ایک تاروں کے رنگ نکھر رہے تھے یکایک ایک تازہ اور بہت ہی روشن اور حسین نظر آنے لگا دور کہیں مرغ بولا اور پھر گھڑیال نے پانچ بجائے

میرے دوست نے کہا "مجھے کیا معلوم تھا تم اتنے تھکے ماندے رام گڑھ پہنچو گے، میں نے تو یہ دعوت تمہاری خاطر منعقد کی تھی۔ اور تم.... سوتے رہے"

میں نے جمائی لے کر کہا۔ بھئی معاف کرنا، میرے پاس پیسے بالکل نہیں تھے کمبخت کبھی نہیں ہوئے تھرڈ میں آیا۔ اب تم ہی بتاؤ....

تھرڈ میں؟ لاحول ولا۔ بھئی رئیس اندھا دھند نہ کھیلا کرو۔

"کون چندلیس کھیلتا ہے، وہ تو یوں سمجھو کہ...."

اچھا یہ بتاؤ کہ اب ہم کہاں جا رہے ہیں....؟"

"جیل خانے"

"جیل خانے"

"ہاں تمہیں ایک عجیب تماشہ دکھائیں گے کبھی پھانسی دیکھی ہے تم نے؟"

ٹن!

گھڑیال کی یہ گونج میرے خون کی مدہم روانی میں مل گئی - اور پھر اس نے میرے خون کے ذرّے ذرّے کو چونکا دیا ٹن ٹن ٹن، میرے خون کا ہر ذرہ اس صدا سے گونجنے لگا - اور روانی بڑھتی گئی - اور مجھے اپنا گلا گھٹتا ہوا معلوم ہوا میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن خون خود بول رہا تھا اس نے مجھے بولنے نہ دیا، میں آہستہ آہستہ اپنا حلقوم ہلانے لگا۔

"شوفر تمہیں معلوم ہے پھانسی کس وقت دی جائے گی"

"ساڑھے پانچ بجے حضور۔"

"گاڑی تیز چلاؤ۔"

ساڑھے پانچ میں چند منٹ باقی تھے جب ہم جیل خانے کے پھاٹک کے اندر داخل ہوئے اور کار گھما کر اس طرف لے گئے جہاں پھانسی کھڑی تھی یہاں جیل کے ملازمین اور ڈاکٹر اور چند افسر لوگ جمع تھے، ایک چھوٹے سے میدان میں پھانسی کھڑی تھی دو لمبے لمبے سیاہ کھمبے ایک اندھے کنوئیں کے دونوں طرف کھڑے تھے۔ اور اس اندھے کنوئیں کے اوپر لکڑی کا ایک تختہ بچھا ہوا تھا اس پر بھی سیاہ رنگ کیا ہوا تھا اور دونوں کھمبوں کے

درمیان جو دو لوہے کے تار تھے ان کا رنگ بھی سیاہ تھا۔ اور ان دونوں میں ڈیڑھ دو فٹ کا فاصلہ تھا یہ دونوں تار ایک دوسرے کے متوازی دونوں کھمبوں کے بیچ میں چلے جاتے تھے میدان کے چاروں طرف اونچی دیواریں تھیں جن کے اوپر کانچ کے تیز ٹکڑے لگے تھے اور ان سے پرے شمال مشرق میں پہاڑوں کی چوٹیاں دھندلی نظر آتی تھیں آسمان اب ابر آلود ہو گیا تھا۔ ہم بھی ڈاکٹر کے پاس جا کھڑے ہوئے وزیر صاحب کے لڑکے کو دیکھ کر دو ایک افسروں نے ہمیں سلام کیا۔ چہرے دھندلے دھندلے نظر آتے تھے۔ قریب کی دیوار کا سایہ ایک سیاہ لبادے کی طرح تماشائیوں کے چہروں پر پھیلا ہوا تھا۔ سب خاموش تھے چند لوگ سگریٹ پی رہے تھے۔ سگریٹ کا دھواں اور گرم گرم سانس کا دھواں فضا میں بل کھاتا ہوا نظر آتا تھا۔

میں نے آسمان پر روشن ستارے کو ڈھونڈا، جیسے بچہ خواب میں ڈر جانے پر اپنی ماں کی چھاتی ڈھونڈتا ہے۔ لیکن مطلع ابر آلود ہو چکا تھا اور اب تو ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی کالی کالی دو چار چھتریاں کھل گئیں لیکن بارش بالکل معمولی سی تھی جیسے ہلکی ہلکی اوس گر رہی ہو۔ ستارہ کہیں نظر نہ آیا۔

میں نے نا اُمید ہو کر اپنے دوست سے کہا "چلو چلیں!"

وہ بولا "بڑے بُزدل ہو یہ منظر تمہیں زندگی بھر اور کہیں دیکھنا نصیب

نہ ہو گا۔"

کہیں لوہے کا ایک پھاٹک کھلا۔ پھر سفید اُجلے کپڑے پہنے ہوئے ایک درمیانے قد کا آدمی پھانسی کی طرف چلتا ہُوا نظر آیا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا اور چہرے پر چھدری سی ڈاڑھی تھی وہ بالکل ہمارے قریب سے گزرا اور اس کا چہرہ سپید اور ستا ہُوا تھا اور اس کے ہاتھ پیچھے پیٹھ پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے قریب سے ایک لمحہ کے لئے رُکا اور اپنے پہرہ داروں سے مخاطب ہو کر پھانسی کے کالے کھمبوں کی طرف اشارہ کرکے بولا۔

"وہ آگئی میری جان لینے والی۔"

اس کی مسکراہٹ میں کیسی مردنی تھی۔ اس کی آواز میں کیسی تھرتھراہٹ تھی جیسے اس زندہ جلد میں ہوتی ہے، جیسے چھری کی تیز دھار ذبح کرنے کے وقت چھوئے اس کی چال میں کیسی اکھڑی اکھڑی سی جھجک تھی، جیسے وہ اپنی ٹانگوں سے نہیں لکڑی کی ٹانگوں سے چلتا ہو۔ پھر بھی وہ بہادر آدمی تھا۔ دلیر آدمی تھا۔ اور بغیر کسی سہارے کے پھانسی کے تختے پر چڑھ گیا اور خدا کا نام لینے لگا، بلند صاف یقین آمیز آواز میں ......!

وہ کس طاقت کو ہلا رہا تھا۔

میں نے اپنے دوست سے پوچھا "جلاد کہاں ہے؟"

جیسے میرے سوال کا جواب دینے کے لئے ایک آدمی ایک لمبا سفید کوٹ اور پتلون اور سیاہ بوٹ پہنے ہوئے آگے بڑھا اور پھانسی کی طرف چلتا گیا۔ اس کے سر پر سفید پگڑی تھی اس کا قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا تھا وہ سیدھا دائیں ہاتھ کے کھمبے کے قریب کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنا ہاتھ لوہے کی پھرکی پر رکھ دیا۔ جس پر ریشمی ڈوری بندھی تھی اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک سفید کپڑے کا غلاف تھا۔

میرے دوست نے کہا پرانے زمانے گئے۔ آج کل تو جلاد بھی بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں کسی قاتل کا خون معاف کر دیا تھا۔ اور وہ اس کے عوض سرکاری جلاد بنا دیا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قاتل کو اسی لئے معاف کیا جاتا تھا۔ اسی شرط پر کہ وہ سرکاری جلاد بن جائے۔

"اور اب؟" میں نے پوچھا۔

"اب معاملہ دوسرا ہے اب تو قانون اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ محض جلاد بنانے کے لئے کسی کا خون معاف کر دیا جائے۔ اور عام طور پر لوگ جلاد کے پیشے کو ...... میرا مطلب ہے اچھا نہیں سمجھتے"

"کیوں؟ ہم قتل کرنا پسند کرتے ہیں۔ اور پھر اگر کوئی قتل کرے اسے پھانسی بھی دیتے ہیں۔ پھر جلاد کے پیشے میں کیا برائی دیکھتے ہیں۔

کیا کہیں انسانی ضمیر کے اندر کوئی پھانس رہ جاتی ہے"

جلاد کے پیشے کے لئے ہمیں امیدوار نہیں ملتے حالانکہ ریاست میں اس کے لئے تنخواہ بھی گریڈ بھی اور ترقی کا انتظام بھی خاطر خواہ موجود ہے۔ پھر بھی جلاد بننے کے لئے کوئی نہیں ہوتا اور اب تو جلاد کا کام بھی اس قدر آسان ہو گیا ہے بس چند لمحوں کی بات ہے۔

میرا دوست کہہ رہا تھا۔ اب فیروز کو پھانسی کے لئے بھی کوئی جلاد نہیں ملتا تھا۔ بہتری کوشش کی آخر یہ آدمی راضی ہوا یہ اسی جیل میں کمپونڈر ہے۔ وہ ایک مرتبہ خود بھی رشوت ستانی کے جرم میں قید ہو چکا ہے مریضوں کے پٹنے میں بڑی مہارت رکھتا ہے اور زخموں کی چیر پھاڑ میں تو اس کا مقابلہ اور کوئی کمپونڈر . . . . . نہیں کر سکتا۔

یکایک فیروز نے پوچھا "میرے تار کا کوئی جواب آیا؟"

ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا "مجھے افسوس ہے فیروز، تمہارے تار کا کوئی جواب نہیں آیا۔"

رحم کی آخری درخواست ٹھکرا دی گئی تھی۔

"تم اپنے بیوی بچوں سے مل سکتے ہو۔"

یکایک لوہے کا دروازہ پھر کھلا۔ اور دو عورتیں اندر داخل ہوئیں دونوں کے ساتھ بچے تھے۔

دو ننھی لڑکیاں اور ایک لڑکا اور ایک کالا دوپٹہ اوڑھے ہوئی عورت کے ساتھ دو لڑکے تھے۔ جنہوں نے چھوٹی چھوٹی سفید ٹوپیاں پہن رکھی تھیں دو پلی ٹوپیاں۔

دائیں کھمبے پر کالے دوپٹہ والی عورت کھڑی ہو گئی بائیں کھمبے پر وہ لالائن اور اس کے لڑکے۔

"یہ کیا تماشا ہے؟" میں نے پوچھا

میرے دوست نے جواب دیا "وہ لالائن مقتول مہاجن کی بیوی ہے وہ اس کے دونوں لڑکے ہیں ـــــ"

فیروز نے ہنس کر کہا "چھوٹے شاہ جی، اپنے باپ کے قاتل کی پھانسی دیکھنے آئے ہو"

میں نے کہا "یہ انتہائی ظلم ہے، ان لوگوں کو یہاں نہ آنے دینا چاہیئے"

میرا دوست بولا "پہلے تو اس ریاست میں کیا ساری دنیا میں سر بازار پھانسی دی جاتی تھی، تاکہ سب کو عبرت حاصل ہو۔

"چھوٹے شاہ جی کا اب کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا" فیروز نے تلوار کی دھار کی طرح تیز لہجے میں کہا۔

دائیں طرف اس کی بیوی اپنے بچوں کو لئے کھڑی تھی۔ لیکن فیروز نے ان کی طرف نہ دیکھا۔ بس وہ عورت اس کی طرف تکتی گئی اور فیروز لالائن

اور اس کے بچوں کی طرف دیکھتا رہا۔

یکایک ننھی لڑکی نے ہاتھ پھیلائے اور کہا "ابا"

ابا !!

ابا !!!

فیروز نے ایک لمحہ کے لیئے شمال مغرب کی طرف مڑ کر دیکھا لیکن روشن ستارہ کہیں نہ تھا۔ چاروں طرف بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔

میں نے اپنے دوست سے کہا "یہ انتہائی ظلم ہے ان بچوں کو یہاں آنے کی اجازت نہ ہونی چاہیئے۔

لڑکی نے کہا۔ "ابا ۔۔۔ ابا ۔۔۔۔ ابا!"

فیروز نے آہستہ سے جلاد سے کہا "مجھے جلدی سے اٹھا دو میں اپنی بچیوں کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔

میرے دوست نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے کچھ کہا اس نے حکم دیا کہ اب دونوں عورتوں اور بچوں کو وہاں سے ہٹا دیا جائے۔

لوہے کا پھاٹک ایک بار پھر کھلا اور لالٹین اور اس کے دونوں بیٹے باہر چلے گئے۔ فیروز کی بیوی ایک بار رکی، مڑی اور چیخ مار کر اپنے خاوند کی طرف بڑھنا چاہتی تھی کہ پہرہ داروں نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا اور اسے

لوہے کے پھاٹک سے دھکیل کر دور کہیں جیل خانے کی دوسری طرف لے گئے ہم نے گھڑی دیکھی، ابھی ساڑھے پانچ بجنے میں چار منٹ باقی تھے۔

"تم کچھ کہنا چاہتے ہو فیروز!" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"دعا کرو میرے لئے دعا کرو۔ سب لوگ میرے لئے دعا کرو" فیروز کی آواز اس غلاف کے اندر سے اس طرح آرہی تھی جیسے وہ کسی تاریک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا اور پھندے کی گانٹھ کو اس کے گلے میں فٹ کر دیا! انصاف کی رسّی!

فیروز زور زور سے اور تیزی سے اپنے خدا کو یاد کرنے لگا۔

وہ کس طاقت کو پکار رہا تھا

ایک منٹ گزر گیا

دوسرا منٹ گزر گیا

تیسرا منٹ گزر گیا

چوتھا منٹ گزر گیا

ٹن! جیل خانے کے گھڑیال نے بجایا۔ گونج فضا میں تھرانے لگی۔

ڈاکٹر نے سفید رومال ہلایا اور دائیں کھمبے کی پھر کی ہلی اور پھانسی کا تختہ بیچ میں سے شق ہو گیا اور عین اسی لمحے فیروز ہماری آنکھوں کے سامنے سے گم ہو گیا۔ وہ اب ان دونوں تختوں کے نیچے اندھیرے

کنوئیں میں اس ریشمی ڈوری سے لٹکا ہوا دم توڑ رہا تھا۔

صرف چند سیکنڈ کے لئے لاش تڑپی جس طرح بجلی کا تار جسم سے چھو جائے۔ ایک سیمابی اضطراری حرکت، کرب اور بے چینی اور مہیب اضطراب جیسے لاکھوں ٹن پانی کا طوفان یکایک جہاز سے ٹکرا جائے جیسے ریلتا ہوا لاوا یکایک کسی آتش فشاں چوٹی سے پھٹ پڑے اور فضا میں آگ ہی آگ برسا دے، جیسے خون کی ہر بوند میں اور دماغ کی ہر نس میں بارود کا فلیتہ یکایک بھک سے اڑ جائے، نہیں، جب بھی نہیں۔ اس تڑپ، اس اضطراب اس کرب کا جواب دُنیا میں کہیں نہیں ہے جب روح اور جسم اس طرح زبردستی ایک دوسرے سے جدا کئے جاتے ہیں۔

وہ اضطراب، وہ حرکت، وہ تڑپ، بجلی کی ٹیڑھی لکیر کی طرح میری روح کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے آپ کو مرتے دیکھا۔ اپنے ایمان کو خاکستر ہوتے دیکھا اپنے تہذیب و تمدن کو خس و خاشاک کی طرح جلتے ہوئے دیکھا۔

وہ انسان، وہ اُس کا خدا، وہ اس کی تہذیب جس نے اس پھانسی کو روا رکھا ہے۔ جس نے خون کا بدلہ خون میں لینا چاہا ہے کبھی پنپ نہیں سکتے، کبھی اُٹھ نہیں سکتے کبھی بلند نہیں ہو سکتے فیروز کی صورت

یاد نہیں۔ ہاں یاد کے ہر کونے میں پھانسی کا تختہ دیکھتا ہوں جس پر ایک سفید کپڑوں میں ملبوس صورت دیکھتا ہوں، اس کا چہرہ غلاف کے اندر ہے اور اس کے بازو پیچھے بندھے ہوئے ہیں۔

یہ صورت جب بھی اکیلا ہوتا ہوں، میرے سامنے آتی ہے اور ایک خاموش طعنہ بن کر مجھ سے پوچھتی ہے، مجھے جانتے ہو میں انسان ہوں، نیکی اور بدی کا پتلا، ازلی، ابدی انسان تم نے مجھے ایک ریشمی ڈوری سے اندھے کنویں میں لٹکا رکھا ہے، کیا مجھے کبھی رہائی نصیب نہ ہوگی۔

○

مامتا

کوئی دو بجے کا وقت ہو گا، بادلوں کا ایک ہلکا سا غلاف چاند کو چھپائے ہوئے تھا، یکایک میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ساتھ کی چارپائی پر اماں سسکیاں لے رہی ہیں۔

کیوں امی! میں نے گھبرا کر آنکھیں ملتے ملتے پوچھا۔

"کیوں۔ امی!" اماں نے سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان میرے

سوال کا غصہ سے دہراتے ہوئے کہا۔ شرم نہیں آتی۔ باپ کو بھی اور بیٹے کو بھی۔ اتنے بڑے ہو گئے ہیں کچھ خدا کا خوف نہیں۔

آخر ہُوا کیا؟ میں نے جلدی سے بات کاٹ کر پوچھا۔ یہ آدھی رات کے وقت رونا کیسا؟

گرمیوں کے دن تھے ہم سب برآمدے میں سو رہے تھے۔ مگر ابّا اندر سامنے ایک کمرے میں سو رہے تھے۔ اُن کی طبیعت ناساز تھی۔ اور انہیں اکثر گرمیوں میں بھی سردی لگ جانے کا اندیشہ لاحق رہتا ہے۔ اس لئے عموماً وہ اندر ہی سویا کرتے ہیں۔

آخر اُن کی آنکھ بھی کھل گئی۔ وہیں بستر پر سے کروٹ بدل کر بولے "کیا بات ہے وحید؟ تمہاری اماں کیوں رو رہی ہیں"

"میں کیا بتاؤں ابّا، بس رو رہی ہیں۔"

"ہاں، اور تمہیں کس بات کی فکر ہے" اماں کی ہچکیاں اور بھی تیز ہو گئیں "پتہ نہیں میرا لال اس وقت کس حالت میں ہے میرا چھوٹا محمود، اور تم یہاں پڑے آرام سے سو رہے ہو وہاں اس کا کون ہے۔ نہ ماں، نہ بھائی نہ بہن، اور تم یہاں خراٹے لے رہے ہو۔ آرام سے، جیسے تمہیں کسی بات کی فکر ہی نہ ہو۔ (سسکتے ہوئے) میں نے ابھی ابھی اپنے چھوٹے محمود کو خواب میں دیکھا ہے۔ وہ ایک میلے کچیلے بستر میں پڑا بخار سے تپ رہا تھا۔

اس کا بدن تنور کی طرح گرم تھا۔ وہ کراہتے ہوئے اماں، اماں کہہ رہا تھا" یہ کہہ کر اماں زور سے رونے لگیں۔

اماں کا "چھوٹا محمود" اور میرا بڑا بھائی لاہور بی-اے میں تعلیم پاتا تھا تھرڈ ائیر میں۔ میں ایف-اے کا سالانہ امتحان دے کر لاہور سے یہاں مئی کے مہینے ہی میں آ گیا تھا۔ مگر محمود کو ابھی لاہور کی تپتی ہوئی فضاؤں میں پورا ایک ماہ اور گزارنا تھا۔ لیکن اب جون کا مہینہ بھی گذر گیا تھا اور محمود ابھی تک لاہور سے واپس نہ آیا تھا۔ اور اماں بہت پریشان تھیں۔ اور سچ پوچھئے تو ہم سب بہت پریشان تھے۔ ہم نے پرسوں ایک تار بھی دے دیا تھا۔ اور مدتوں کے بعد اچانک کل ہی محمود کا خط آیا تھا۔ چند مختصر سطور تھیں لکھا تھا "میں بیمار ہوں۔ ملیریا کا بخار ہے۔ لیکن اب ٹوٹ رہا ہے۔ چند دنوں سے بہت بارش ہو رہی ہے۔ اگر لاہور کا یہ حال ہے تو اسلام آباد کا کیا ہو گا۔ کیا کشمیر آنے کا راستہ کھلا ہے۔ جلدی لکھئے کہ کس راستے سے آؤں۔ کیا جموں یا بانہال روڈ سے آؤں کہ کوہالہ۔ روبڑی سڑک سے کون سا راستہ بہتر رہے گا؟" ہم نے سوچ بچار کے بعد ایک تار دے دیا تھا۔ گو بارش بہت ہو رہی تھی۔ اور دونوں سڑکیں شکستہ حالت میں تھیں پھر بھی کوہالہ روبڑی روڈ سے بہتر حالت میں تھی۔ اس لئے یہی مناسب سمجھا کہ محمود کوہالہ روڈ ہی سے آئے۔ اب آدھی رات کے وقت

یہ افتاد آپڑی۔

ابا کی نیند پریشان ہوگئی تھی۔ چیں بجبیں ہوتے ہوئے بولے تو اس وقت کیا کیا جائے۔ اور تمہیں تو یونہی دل میں وسوسے سے اٹھا کرتے ہیں۔ بھلا اس کا علاج کیا ہے؟ آخر محمود کوئی بچہ تو نہیں؟ تمہیں فکر کس بات کی ہے۔ ہزاروں ماؤں کے لال لاہور پڑھتے ہیں اور ہوسٹلوں میں رہتے ہیں آتا ہی ہوگا۔ اگر آج صبح وہ لاہور سے چلا ہو۔ تو شام کو وہ راولپنڈی پہنچ گیا ہوگا۔ کل کو ملے، اور

اماں جلدی سے بولیں اور ——؟ اور ——؟ کیا غضب کرتے ہو۔ اور اگر خدانہ کرے۔ اس کا بخار کبھی نہ ٹوٹا ہو تو پھر؟ میں پوچھتی ہوں تو پھر؟ یہ کہہ کر اماں رک گئیں اور دوپٹہ سے آنسو پونچھ کر کہنے لگیں۔ مجھے موٹر منگوا دو۔ میں ابھی لاہور جاؤں گی۔

اب تم سے کون بحث کرے ہمیں تو نیند آئی ہے یہ کہہ کر ابا کروٹ بدل کر سو رہے۔ میں نے بھی یہی مناسب جان کر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر کانوں میں اماں کی مدھم سسکیوں کی آواز جیسے وہ دبانے کی بہت کوشش کر رہی تھیں۔ برابر آرہی تھی۔ کیا دل ہے ماں کا اور کتنی عجیب ہستی ہے اس کی؟ میں آنکھیں بند کئے ہوئے سوچنے لگا۔ ماں کا دل، ماں کی محبت ماں کی مامتا، کس قدر عجیب جذبہ ہے عالم جذبات میں اس کی نظیر ملنی محال

ہے۔ نہیں یہ تو اپنی نظیر آپ ہے۔ ایک سپنے کے دھندلکے میں اپنے بیمار بیٹے کو دیکھتی ہے اور چونک پڑتی ہے۔ لرز جاتی ہے۔ ماںتا! کیا اس جذبے کی اساس محض جسمانی ہے۔ محض اس لئے کہ بیٹا ماں کے گوشت و پوست کا ایک ٹکڑا ہے؟ اور کیا ہم سچ مچ فلابیر کے تخیل کے مطابق اس کائنات میں اکیلے ہیں۔ تنہا بے یار و مددگار۔ ایک دوسرے کو سمجھتے ہوئے بھی ناآشنا، مگر میں بھی تو محمود کا بھائی ہوں۔ میری رگوں میں بھی وہی خون موجزن ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ اور میں اپنی زندگی کے ان بیس سالوں میں صرف دو دفعہ محمود سے جدا ہوا ہوں۔ اور وہ بھی نہایت قلیل عرصوں کے لئے۔ پھر میں کیوں اس کے لئے بے تاب و بے قرار نہیں ہوا تھا۔ ماںتا! کیا ہم سچ مچ پتھروں کے تودے کی طرح ہیں۔ مصر کے میناروں کی طرح خوبصورت لیکن بے جان۔ اشوک کے کتبوں کی طرح۔ سبق آموز لیکن بے حس بے روح؟ ماںتا! بدھ نے کہا تھا کہ یہ دنیا دھوکا ہے سراب ہے مایا ہے ہوگی۔ لیکن یقین نہیں پڑتا۔ آخر یہ حسین جذبہ کہاں سے آیا اور کائنات کے ایک گوشے میں سسکتی ہوئی ماں۔ کیا یہ بھی ایک دھوکا ہے؟ سچ جانئے یقین نہیں پڑتا

چھوٹا محمود۔ میرا ننھا محمود۔ میرا لال

امی ہلکی ہلکی ہچکیوں میں بھائی کا نام لے رہی تھیں۔ کتنی معمولی سی بات تھی۔ بھائی جان شاید ابھی لاہور میں ہی ہوں گے۔ ضیافتیں اڑاتے ہوں گے، سینما دیکھتے ہوں گے۔ یا اگر لاہور سے چلے آئے ہوں۔ تو راولپنڈی اس وقت خواب خرگوش میں پڑے خراٹے لے رہے ہوں گے۔

ملیریا؟ کیا عجیب ملیریا کا بخار مطلق ہی نہ ہو۔ میں بھائی کے بہانوں کو خوب جانتا ہوں۔ اماں بھی جانتی ہیں، مگر پھر بھی رو رہی ہیں آخر کیوں؟ مامتا! شاید یہ کوئی روحانی قرابت ہے۔ شاید اس دنیا کے وسیع صحرا میں اکیلے نہیں ہیں۔ شاید ہم محض پتھروں کے تودوں کی طرح نہیں ہیں۔ شاید اس انسانی مٹی میں کسی ازلی آگ کے شعلوں کی تڑپ ہے معاً مجھے موپاساں کا افسانہ "تن وتنہا" یاد آگیا جس میں اس نے اس شدید احساس تنہائی کا رونا رویا ہے۔ آہ۔ بیچارہ موپاساں، وہ ایک ماہر نفسیات تھا۔ اور ایک ماہرِ نفسیات کی طرح وہ کئی بار نفسیاتی واردات کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے قاصر رہا اس کے افکار نے اسے اکثر غلط راستہ پر ڈال دیا "تن وتنہا" ایک ایسی ہی مثال ہے وہ لکھتا ہے:۔

"عورت ایک سراب ہے اور حسن ایک فروعی امر۔ ہم ایک دوسرے کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے، میاں بیوی سالہا سال ایک دوسرے

کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں۔ دو دوست ملتے ہیں اور ہر دوسری طاقت پر ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ نسوانی محبت مستقل دھوکا ہے۔ اور جب میں عورت کو دیکھتا ہوں تو مجھے چاروں طرف موت ہی موت نظر آتی ہے۔"

میں نے آنکھیں کھول کر اماں کی طرف دیکھا۔ امی روتے روتے سو گئی تھیں۔ گال آنسوؤں سے گیلے تھے اور بند آنکھوں کی پلکوں پر آنسو چمک رہے تھے۔ کیا امی موت ؟ اور کیا ماتا بھی کوئی ایسا ہی ہلاکت آفریں جذبہ ہے ؟ شاید موپاساں غلطی پر تھا۔ شاید اسے یہ لکھتے وقت اپنی شفیق ماں کی یاد نہ آتی تھی۔ وہ اس کی جاں بخش لوریاں، وہ نرم نرم تھپکیاں، جبکہ وہ بچوں کی طرح صرف "اُوں۔اُوں" کہہ کر بلبلا اٹھتا تھا اور اس کی چھاتی سے لپٹ جاتا تھا۔ نسوانی محبت مستقل دھوکا ہے۔ شاید اسے اپنی اماں کے وہ طویل بوسے بھول گئے کہ بڑا ہونے پر بھی اس کا نفسیاتی سر اپنے بازوؤں میں لے لیتی تھی اور پیار کرتی تھی۔ جب وہ ماتا سے بے قرار ہو جاتی تھی اور اس کی غیر حاضری میں بھی اس کی راہ دیکھا کرتی تھی اور ہر گناہ کو نیکی میں مبدل کر دیتی تھی۔ اس دنیا میں ہم اکیلے نہیں ہیں۔ بلکہ ہمارے ساتھ ہماری مائیں ہیں وہ شدید احساس تنہائی جس کی موپاساں کو شکایت

ہے۔ جو دنیوی کلفتوں اور الفتوں میں بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا
نہ جانے وہ ماں کی گود میں آکر وہ کیسے ناپید ہو جاتا ہے؟ ماں
کے جذبہ محبت میں ایک ایسی دیوانگی وارفتگی ہے جو اس کی انانیت
کو فنا کر دیتی ہے۔ اور اس کی ذات کو بچوں میں منتقل کر دیتی ہے
یقیناً ہم اس دنیا میں اکیلے نہیں ہیں۔ بلکہ ہمارے ساتھ ہماری
مائیں ہیں۔ یقیناً مگر۔

"غٹرغوں، غٹرغوں، ککڑوں کوں، ککڑوں کوں" کبوتر، مرغ، چڑیاں،
دوشیزۂ سحر کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ اُن کی خوش الحانی نے مجھے بیدار
کر دیا۔ میں اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ ٹانگیں چارپائی سے نیچے لٹکا دیں
اور آنکھیں ملنے لگا۔ اتنے میں آنگن سے اماں کی آواز آئی۔ بیٹا وحید
اٹھو، محمود آ گئے۔

آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تو سچ مچ —— اماں آنگن میں اُگے ہوئے
پنجتارے کے بوٹے کے نیچے ایک مونڈھے پر بیٹھی تھیں۔ اور محمود
ان کے پیروں پر جھکا ہوا تھا۔ میں جلدی سے اُٹھا۔ آنگن میں ہم دونوں
بھائی بغل گیر ہوئے۔

اتنے دن کہاں رہے؟ میں نے محمود سے پوچھا
محمود نے شوخ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور ایک آنکھ میچ لی۔

پھر گردن موڑ کر پچھتاوے کے سُرخ سُرخ پھولوں کے گچھوں کو غور سے دیکھنے لگا۔

"کوئی سات روز جھڑی رہی۔ متواتر بارش ہونے سے سڑک جگہ جگہ سے بہہ گئی تھی اور سپرنٹنڈنٹ ٹریفک نے راستہ بند کر دیا تھا۔"

اس نے آہستہ سے جواب دیا اور یہ کہہ کر ہاتھ سے میرے ہاتھ کو پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگا۔

اماں کدو چھیل رہی تھیں اور ہم دونوں کو دیکھتی جاتی تھیں۔ ان کی آنکھیں پُرنم تھیں آنسوؤں کے ان دو سمندروں میں خوشیوؤں کی جل پریاں ناچ کر رہی تھیں۔

○

بھولا

۱

پہلی بار جب میں نے گوروپال سنگھ کو دیکھا تو اُس کا سارا منہ سوجا ہوا تھا اور اُس نے اپنی ڈھیلی پگڑی کے شملے سے اپنے مُنہ کو چھپا رکھا تھا اور شملے سے اُوپر گھنی بھنووں کے نیچے اُس کی بڑی بڑی حیران آنکھیں درد سے کراہتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

"ڈاڑھ کا درد ہے ؟" میں نے اُس سے پوچھا۔ اُس نے اثبات میں

سر ہلایا۔

میں نے اُس کا منہ کھول کر دیکھا۔ ڈاڑھ اپنی جگہ سے ہل چکی تھی اور ڈاڑھ کے ارد گرد سیاہ خون جم گیا تھا اور مسوڑھے بھی سوجے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی اناڑی نے ڈاڑھ کو کھینچ کر نکالنے کی کوشش کی ہے

"مجھ سے پہلے کس دندان ساز کے پاس گئے تھے؟" میں نے گوردیال سے پوچھا۔

گوردیال بولا سٹیشن کے باہر فٹ پاتھ پر ایک دانت والا بیٹھا ہے وہ منتر پھونک کر دانت نکالتا ہے۔ بولتا تھا۔ میرے منتر سے ڈاڑھ میں ذرا بھی درد نہیں ہوگا۔ اور ڈاڑھ ایک ہی جھٹکے سے نکل آئے گی۔ اور صرف آٹھ آنے لوں گا۔"

"پھر؟"

گوردیال جواب میں درد سے بلبلایا۔ اتنے لمبے چوڑے چھ فٹ کے جوان کا بلبلانا عجیب مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ مگر دانت کا درد ہے بھی بُری چیز۔ محبت کا درد اور دانت کا درد دونوں بُری بلا ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ دانت کا درد محبت کے درد پر بھی بھاری ہے۔ اگر کسی شخص کو بیک وقت محبت کا درد اور دانت کا درد لاحق ہو جائے تو وہ سب سے پہلے اپنے دندان ساز کے پاس جائے گا۔ بعد میں اپنی محبوبہ کے پاس! اگر

دانت کا درد محبت کے درد سے سوا نہ ہوتا تو میں نے آج دندان سازی کا پیشہ چھوڑ کر عشق سازی کا مطب کھول لیا ہوتا جہاں لوگ اپنے دل کا درد لے کر آتے اور اپنی عقل کی ڈاڑھیں نکلوائے چلے جاتے!

گوروپال نے درد کی شدت سے اپنی دونوں آنکھیں اس زور سے بند کرلیں جیسے درد اس کے دانت میں نہیں اُس کی آنکھ میں ہوتا ہے — اُس نے پچکے ہوئے لہجے میں کہا۔

پہلے تو جی اُس نے ایک کالا دھاگا لے کر اُس پہ ایک منتر پڑھا۔ پھر مجھ سے آٹھ آنے لے کر اپنی جیب میں ڈالے۔ پھر اُس نے وہ کالا دھاگا لے کر میری ڈاڑھ کی سوراخ میں ڈال کر جو جھٹکا دیا ہے تو مجھے عرش کے تارے نظر آ گئے ....."

گوروپال کا سارا جسم اُس تکلیف دہ لمحے کی یاد سے لرز گیا۔

سب سے پہلے میں نے اُسے دانت کا درد دور کرنے کی دوا کھلائی چند منٹ گزر جانے کے بعد جب اُس کا درد مغلوب ہو گیا تو وہ کھسیانے طریقے سے کچھ مسکرا کے اور کچھ خفا ہو کے بولا۔

"اب مجھے کیا معلوم تھا۔ ڈاکٹر صاحب۔ وہ آدمی پیسہ لے کر بے ایمانی کرے گا۔ پیسہ لے کر تو آدمی کام کرتا ہے بے ایمانی نہیں کرتا ہے۔"

بمبئی میں کب سے ہو؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

گوروپال نے انگلیوں پر گن کر کہا۔" آج پورے پندرہ دن ہو گئے۔"

"کیا کام کرتے ہو؟"

"کام؟" گوروپال اپنی ڈاڑھی کھجلاتے ہوئے بولا۔

"میں اُدھر پٹی خورد ضلع لدھیانے میں کھیتی باڑی کرتا تھا اور باپ میرا ٹرک چلاتا تھا مگر دو ماہ ہوئے میرا باپ مرگیا۔ تو میں کھیتی باڑی اپنے چھوٹے بھائی کو سونپ کر باپ کا ٹرک لے کر بمبئی آ گیا سُنا تھا یہاں بمبئی میں بہت کام ملتا ہے۔"

"پھر بولا؟"

میونسپلٹی میں ٹنڈر بھر دیا ہے جی۔ پتھر ڈھونے کا۔ اب ٹنڈر پاس ہو جائے تو کچھ پتہ چلے۔ ابھی تو میرے پاس کوئی گراج بھی نہیں ہے اور رہنے کی کوئی جگہ بھی نہیں ہے۔ ادھر آپ کی بغل والی روڈ پر سردار بنتا سنگھ فلوٹ ماسٹر جو رہتے ہیں وہ ہمارے لدھیانے کے ہیں میں نے اُن کے گھر کے باہر سڑک پر ٹرک کھڑا کر دیا ہے اور رات کو میں ٹرک میں سو جاتا ہوں۔ دن بھر میونسپلٹی کے دفتر کے چکر کاٹتا ہوں۔ مگر ابھی تو ٹنڈر پاس نہیں ہوا۔ واہگورو کی کرپا ہو گی تو پاس ہو جائے گا۔"

نیچے کی منزل میں میرا گراج خالی تھا۔ کیونکہ میرے پاس کوئی موٹر گاڑی نہ تھی۔ جب میں تقسیم کے بعد بمبئی آیا تو پارسن مالکن نے مجھے اُوپر کی منزل میں

سے دو کمرے دے دیئے اور نیچے ایک گراج۔ مگر گراج خالی ہی رہا۔ لاہور سے اکھڑنے کے بعد حالات بھی اتنے نہ سدھر سکے کہ گاڑی لے سکوں۔ اس لئے اب سوچا کیوں نہ گراج کرائے پر دے دوں؛

میں نے گوردیال سنگھ سے کہا "گراج تو میرے پاس ایک ہے۔ اور خالی بھی ہے"

"کیا کرایہ ہوگا؟"

"ساٹھ روپے ہوگا!"

ساٹھ روپے یقیناً زیادہ کرایہ تھا، مگر میں نے سوچا ساٹھ کہوں گا تو کہیں تیس چالیس پر فیصلہ ہوگا۔ مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب گوردیال سنگھ نے مجھ سے کسی طرح کا بھاؤ تاؤ نہ کیا۔ اُس نے فی الفور جیب سے ساٹھ روپے نکال مجھے دے دئے اور بولا

"میں آج شام ہی کو ٹرک لے کر آجاؤں گا اور اگر آپ اجازت دے دیں تو خود بھی اُس گراج میں رہ لوں گا"

مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے!" میں نے گوردیال سے کہا۔ جب گوردیال چلا گیا تو میں نے مڑ کر کمپونڈر سے کہا "یہ بے چارہ گوردیال سنگھ بھی کتنا بھولا ہے۔ اسے زندگی کا کچھ پتا ہی نہیں۔

میں نے گراج کے ساٹھ مانگے یہ ساٹھ ہی دے گیا۔۔۔۔!"

(۲)

اس واقعے کے چھ سات روز بعد گوردیال میرے پاس مٹھائی لے کر آیا اور کہنے لگا۔ "ڈاکٹر صاحب میرا ٹنڈر پاس ہو گیا ہے آپ کے گھر آنا تو مجھے بہت پھلا جی!"

"پھلا جی؟" میں نے گوردیال سے استفسار کرتے ہوئے کہا۔ "کیسے یہ تمہارا ٹنڈر منظور ہو گیا میونسپلٹی میں تمہاری کوئی جان پہچان ہو گی؟"

نہیں ڈاکٹر صاحب! اپنی تو کوئی شناخت نہ تھی، مگر میونسپلٹی والوں نے بتایا کہ میرا ٹنڈر سب سے کم پیسے کا تھا۔ اس لئے مجھے مل گیا جی اور میں نے بھی ڈاکٹر صاحب خوب سوچ سمجھ کر ٹنڈر بھرا تھا۔ آنے جانے کے پیٹرول کا خرچہ لگا لیا کلینر کی تنخواہ اور اپنا روز کا خرچہ اور تھوڑی سی مرمت کے پیسے۔ اور مجھے کیا چاہیئے ڈاکٹر صاحب؟ باقی اپنے ہاتھ کی محنت ہے۔ جتنی محنت کروں گا اُتنے پیسے بنا لوں گا۔"

اُس نے لڈو توڑ کر میرے منہ میں ڈال دیا۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

"مبارک ہو گوردیال سنگھ!"

گوردیال سنگھ خوش ہو کر بولا۔ "واہگورو کی کرپا سے میں کل سے پتھر کی کھائی سے پتھر ڈھونا شروع کر دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ کچھ یاد کر کے زور سے ہنسا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے گوردیال؟"

وہ بولا" جب میرا اَنٹر پاس ہوگیا تو انجینئر نے مجھے بدھائی دی اور بولا۔ گوروپال میں تم کو اپنا آدمی دیتا ہوں وہ تم کو کواری دکھا دے گا۔

میں نے ہنس کر کہا کیسی کواری؟ انجینئر صاحب میں تو یہاں پتھر ڈھونے آیا ہوں۔ شادی کرنے نہیں آیا۔ ہمارے پنجاب میں گوروپال نے تشریح کرتے ہوئے کہا۔

کواری تو اس لڑکی کو کہتے ہیں جس کی شادی نہ ہوئی ہو اب مجھے کیا معلوم تھا" گوروپال نے ہنس کر اپنے سپید اور بے حد مناسب دانت دکھاتے ہوئے کہا" بمبئی میں کواری لڑکی کو نہیں کہتے۔ پتھر کی کھان کو کہتے ہیں کواری؟ ہِئے۔۔ ہِئے!

گوروپال سنگھ زور سے ہنسا۔ پھر اپنی ڈھیلی پگڑی سر پہ ٹھیک کرتا ہوا چلا گیا میں نے اپنے کمپونڈر سے کہا۔

" یہ ہمارا گوروپال بھی کتنا بھولا ہے۔ اسے زندگی کا کچھ پتا ہی نہیں"

(۳)

اُسی دن سہ پہر میں جب میں ایک مریض کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا اور لکڑی کا زینہ اُتر کے نیچے گراج کے سامنے سے گزرنے لگا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گوروپال کا ٹرک گراج سے باہر کھڑا ہے اور گوروپال اپنی پگڑی اتارتے ہوئے۔ ایک میلی قمیص کے نیچے ایک میلا کچھا پہنے ہوئے جس کا آزار بند گھٹنوں تک لٹک رہا تھا، ایک لوہے کے ڈرم کو اپنے سامنے

رکھے ہوئے اپنے ٹرک کو پانی سے صاف کر رہا ہے۔

"کواری نہیں گئے"

گوروپال نے میری طرف مڑ کر دیکھا۔ پھر اُس نے ٹرک صاف کرنے والا میلا جھنجھڑا لوہے کے ڈرم میں زور سے پھینک کر کہا۔

"گیا تھا"

"پھر کیا ہُوا؟"

"ٹنڈر نا منظور ہو گیا؟"

"وہ کیسے؟"

گوروپال نے جلدی سے اپنا ازار بند کچھے میں اُڑس لیا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں کواری میں گیا۔ وہاں سے پتھر لاد کے ٹرک بھر لیا اور جہاں پر سڑک کی مرمت ہو رہی تھی وہاں جا کر ٹرک خالی کر دیا۔ اورسیر (OVER SEAR) سے پرچہ لیا، اور یہ پرچہ لے کر انجینئر کے پاس میونسپلٹی کے دفتر پہنچا۔ انجینئر نے میرے ہاتھ میں ایک رسید دے کر کہا یہ دس پھیروں کی رسید ہے یہ رسید لے کر اکاؤنٹنٹ کے پاس جاؤ اور اُس سے دس پھیروں کے پیسے لے لو۔ میں نے کہا "مگر میں نے دس پھیرے نہیں لگائے انجینئر صاحب آپ کو غلطی ہو رہی ہے۔

وہ بولا " وہ سب ٹھیک ہے دس پھیروں کی رسید میں پانچ پھیروں کے پیسے میرے ہیں پانچ تمہارے! سمجھ گئے؟"

میں سمجھ گیا۔ مگر سمجھ کر بھی کچھ نہیں سمجھا میں نے رسید اُس کے منہ پر دے ماری اور بولا "اب ہمارا ملک آزاد ہو چکا ہے انجینئر صاحب۔ اب یہ بے ایمانی نہیں چلے گی اب نہ میں حرام کا پیسہ خود کھاؤں گا نہ تم کو کھانے دوں گا؟"

وہ بولا " تو جاؤ گھر جاکر بیٹھو۔ تمہارا ٹنڈر نامنظور!"

گوردیال نے میری طرف پیٹھ کرلی اور لوہے کے ڈرم سے گیلا چیتھڑا نکال کر زور زور سے اُسے اپنے ٹرک پر رگڑنے لگا۔

میں نے آہستہ سے سر جھکا لیا اور چپ چاپ اپنا مریض دیکھنے کیلئے آگے بڑھ گیا۔

(۴)

اب گوردیال سنگھ کا کام چل نکلا تھا اب میں اسے یا اُس کے ٹرک کو بہت کم گراج میں دیکھتا۔ اور جب کبھی مجھے گوردیال سنگھ نظر آتا تو بے حد خوش اور شگفتہ مزاج دکھائی دیتا۔ کبھی کبھی دو گھوڑے کی بوسکی کی قمیص اور عمدہ ریشمی تہمد پہنے ہوئے ملتا۔ سر پر عمدہ کسی ہوئی کشتی نما پگڑی ہوتی۔ اور اُس کا کلینر بچیتر سنگھ بھی صاف ستھرے کپڑوں میں ہوتا۔ ایک بار ہمسایوں نے مجھ سے شکایت بھی کی کہ کل رات کو گوردیال اور بچیتر سنگھ نے شراب پی کر سڑک پر دنگا کیا۔ مگر مجھے ان کی بات کا یقین نہ آیا۔ پھر بھی میں نے اپنا اطمینان کرنے کے لئے

دوسرے دن علی الصبح گوردیال سے پوچھنا چاہا، مگر جب میں اُوپر کی منزل سے سے نیچے لکڑی کے زینے سے اُتر کر گراج کے باہر پہنچا تو گوردیال اپنا ٹرک لے کر جا چکا تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

چند ہفتوں کے بعد مجھے بنتا سنگھ فلوٹ ماسٹر نے بتایا کہ احمد آباد سے واپس آتے ہوئے بمبئی کے قریب گوردیال نے رونگ سائیڈ پہ ٹرک چلاتے ہوئے ایک آدمی کو ہلاک کر دیا۔ ڈاکٹری معائنے پر گوردیال شراب میں دُھت پایا گیا سُنا ہے کل عدالت میں اُسے دو ماہ کی جیل بھی ہو گئی" بنتا سنگھ دوا کی پڑیا اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے بولا۔

مگر دوسرے دن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے گوردیال کو لکڑیوں کے شکستہ زینے پہ کھٹ کھٹ کرتے چڑھتے ہوئے دیکھا۔ اُس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا اور وہ مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھتے ہوئے سیڑھیاں چڑھتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے چلا کر کہا۔" ارے! مگر گوردیال تمہیں تو جیل ہو گئی تھی؟"

"ہاں جیل تو ہو گئی ہے ڈاکٹر صاحب دو مہینے کی ہی ہوئی ہے!"

"مگر تم تو یہاں موجود ہو؟"

"ہاں!" وہ مسکرا کر بولا۔" میں نے اپنی جگہ بچتر سنگھ کو جیل بھیج دیا ہے۔"

"اپنی جگہ بچھتر سنگھ کو!" حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں" یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ — یہ کیسے ممکن ہے؟

"بہت آسان بات ہے۔" گوروپال سنگھ سمجھاتے ہوئے بولا۔ "میں نے اپنی جگہ مقدمے میں بچتر سنگھ کو کھڑا کر دیا تھا۔ جب وکیل نے اس سے پوچھا تمہارا نام؟ تو وہ بولا گوروپال سنگھ۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟ ڈپی خورد ضلع لدھیانہ۔ یہ اس کی ڈمنٹ (ایکسیڈنٹ) تم نے کیا؟ جی ہاں، تم رونگ سائیڈ پر تھے؟ جی ہاں۔ تم نے شراب پی رکھی تھی؟ جی ہاں۔ تم اقبال جرم کرتے ہو؟ جی ہاں!

عدالت نے اُس کو دو ماہ کی سجا دے دی۔ وہ اب جیل میں ہے اور میں جیل کے باہر ہوں۔ میری جگہ وہ دو مہینے وہاں رہے گا۔ اور میں یہاں باہر رہ کر ٹرک چلاؤں گا اور اپنا اور اُس کے بال بچوں کا پیٹ پالوں گا۔ دھندا تو چالو رہنا چاہیے ڈاکٹر جی اور میرا احمد آباد والے کام میں بہت فائدہ ہے۔ اب میں دو ٹن کے بجائے تین ٹن کا مال ٹرک میں بھر کے لے جاتا ہوں اور آتے جاتے دونوں طرف کے ناکوں کا بھتہ کٹا کر کے بھی بہت فائدے میں رہتا ہوں۔ ایمانداری اس دیس میں گناہ ہے ڈاکٹر صاحب! اگر میں ایمان دار رہتا تو آج بھوکا مرتا۔ ابھی بچتر سنگھ کی بیوی رو رہی تھی۔ بول رہی تھی سب جا کے عدالت میں کہہ دوں گی۔ میں نے اُسے دو سو روپے دے دیئے تو چپ ہو گئی۔ آخر وہ بھی کیا کرے۔ بال بچوں کا پیٹ تو اُسے بھرنا ہے اور اگر بچتر سنگھ میری جگہ جیل نہ جاتا تو آج یہ ٹرک چلا

کے کمائی کون کرتا؟ کیوں؟"

مگر مجھے کسی طرح یقین نہ آرہا تھا۔ "مگر گوردیال سنگھ! میری سمجھ میں نہیں آتا ہے، یہ کیسے ممکن ہوا۔ تم یہاں، تمہاری جگہ کوئی دوسرا آدمی جیل میں؟ — یہ — یہ — یہ کیسے ہو سکتا ہے!"

گوردیال سنگھ ہنسا۔ اُس نے ڈبے سے ایک پیڑا نکال کر میرے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"آپ بھی کتنے بھولے ہیں ڈاکٹر صاحب! آپ کو زندگی کا کچھ پتا ہی نہیں!"

(ختم شد)

(اشرف پریس، لاہور میں طبع ہوئی)